THE
END OF INDIA
بھارت کا
خاتمہ
صنم کدوں کے
دیس سے
بلند ہونے والی
صدائے حق
خوشونت سنگھ

بھارت کا خاتمہ

بین الاقوامی شہرت یافتہ ہندوستانی ادیب وصحافی خوش ونت سنگھ کی تازہ ترین اور متنازعہ کتاب THE END OF INDIA کا اُردو ترجمہ

خوش ونت سنگھ

مترجم: محمد احسن بٹ

نگارشات

24- مزنگ روڈ ○ لاہور فون: 0092-42-7322892

E-mail:nigarshat@yahoo.com nigarshat@wol.net.pk

نام کتاب: بھارت کا خاتمہ
مصنف: خوش ونت سنگھ
مترجم: محمد احسن بٹ
ناشر: آصف جاوید
نگارشات، 24 مزنگ روڈ، لاہور
مطبع: المطبعۃ العربیہ، لاہور
کمپوزنگ: اعظم علی شاد
سالِ اشاعت: 2003ء
قیمت: 80 روپے

اظہارِ تشکر

اِس کتاب کی اشاعت جرأتِ اظہار کے پیکر جناب مجید نظامی (ایڈیٹر روزنامہ نوائے وقت) کے شکریے اور احساسِ ممنونیت کے بغیر نامناسب رہے گی جو گزشتہ نصف صدی سے ثابت قدمی کے ساتھ برصغیر کی نسلِ نو کو برہمن کی جنونی ذہنیت سے آگاہ کر رہے ہیں۔ خوشنونت سنگھ کی کتاب کے بعض اقتباسات نظامی صاحب کی فکر اور ''نوائے وقت'' کی تحریروں کی بازگشت محسوس ہوتے ہیں۔

ادارہ

فہرست

چند کلمات

جب کسی پاکستانی تجزیہ نگار یا بھارت کے مسلمان دانشور کی طرف سے یہ خدشہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ اگر بھارت نے تنگ نظری، تعصب اور مسلم دشمنی کا وطیرہ ترک نہ کیا اور تقسیم برصغیر کے صدمے کو بھلا کر اپنی مسلمان اقلیت کے علاوہ پاکستان و بنگلہ دیش کے ساتھ برابری، عدل، انصاف اور بھائی چارے کی بنیاد پر تعلقات استوار نہ کئے تو یہ سوویت یونین کی طرح حصوں بخروں میں تقسیم ہو سکتا ہے تو اسے ایک پاکستانی اور مسلمان کی اندرونی خواہش اور روایتی نفرت کا نام دیا جاتا ہے اور اس ''رجعت پسندانہ'' سوچ کے خلاف ہر طرف سے کائیں کائیں ہونے لگتی ہے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ بھارت انتشار اور شکست و ریخت کے اس عمل سے گذر رہا ہے جس سے ماضی کی کئی ریاستیں گذریں۔ بری بھلی جمہوریت نے آج تک ذات پات، چھوت چھات اور دال بھات کے اس توہم پرست معاشرے کو متحد رکھا ہے۔ مگر جمہوریت و سیکولرازم کے علمبردار اس معاشرے میں مسلمانوں، عیسائیوں، بودھوں اور نچلی ذات کے ہندوؤں کو کچلنے کی جس ریاستی پالیسی پر مختلف حکومتیں عمل پیرا ہیں وہ بالآخر بھارت کو اپنے انجام تک پہنچا کر دم لے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ صرف دعویٰ ہے لیکن اس کے حق میں دلائل خوش ونت سنگھ نے اپنے طویل سیاسی، سفارتی اور صحافتی تجربے کی بنا پر اکٹھے کئے ہیں۔

معروف صحافی اور دانشور خوش ونت سنگھ کی جانب سے جنونی ہندوؤں اور ان کی مکروہ کارروائیوں کے حوالے سے انکشافات ہمارے لئے کوئی نئی بات نہیں ہیں۔ نصف صدی قبل ہمارے بڑے اور خود ہم میں موجود کتنے ہی پاکستانی ''خونیں ہولیوں'' کا نظارہ کر چکے ہیں۔ آج کی بات نہیں، بھارتی سرزمین شروع سے ہی دوسرے مذاہب کے ساتھ انتہائی تنگ نظری کا مظاہرہ کرتی رہی ہے۔ گاندھی کے اہنسا کے دعوے، جنونی ہندوؤں کے بارے میں سابق بھارتی

صدر رادھا کرشنن کی حقائق سے ماورا ''خوش فہمیاں'' اور بدھ مت سے لے کر اسلام تک جنونی ہندوؤں کا ناقابل برداشت رویہ دریا کے دو کناروں کی حیثیت رکھتا ہے جو کبھی نہیں مل سکتے۔ خوش ونت سنگھ کے یہ الفاظ کہ ''اگر بھارت ٹوٹا تو اس کی قصوروار پاکستان سمیت کوئی بیرونی طاقت نہیں بلکہ خود جنونی ہندو ہوں گے''، نظریہ پاکستان کی آفاقیت اور سچائی کا ایک ایسا ناقابل تردید ثبوت ہے جس کو جھٹلانا کسی کے بس میں نہیں۔

جنونی ہندوؤں نے اپنے مفادات اور سیاسی کاروبار چمکانے کے لیے گجرات اور دوسرے علاقوں کے مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ کیا وہ اپنی جگہ ایک دلخراش داستان ہے ہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ خوش ونت سنگھ کا یہ اعتراف کہ وہ خود گجرات گئے اور حالات کا جائزہ لیتے ہوئے ایک سرکاری رپورٹ ان کی نظر سے گزری جس میں بتایا گیا تھا: ''جنونی ہندو بڑے آرام سے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلتے رہے اور پولیس 'خاموش تماشائی' بنی رہی''، صدیوں پرانے جنون کی وہ گواہی ہے جو اکثر اصلیت جاننے والے پاکستانی مسلمان دیتے رہے ہیں لیکن انہیں ''بنیاد پرست'' اور دوستانہ تعلقات میں رکاوٹ قرار دے کر خاموش کرانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

خوش ونت سنگھ کی یہ مختصر تحریریں ایک ایسا آئینہ ہیں جن میں بھارتی حکمرانوں، اہنسا کے پجاریوں اور سیکولرازم کے دعویداروں کو اپنا چہرہ دیکھنا چاہیے اور دنیا کو بتانا چاہیے کہ پاک بھارت کشیدگی کی اصل بنیاد کیا ہے؟ جناب محمد احسن بٹ جنہوں نے ان تحریروں کو اردو کے قالب میں ڈھالا اور ''نگارشات'' کے جناب آصف جاوید مبارکباد کے مستحق ہیں جن کے توسط سے یہ تحریریں قارئین تک پہنچ رہی ہیں۔ ایک زمانے میں کے ایل گابا نے ''مجبور آوازیں'' کے ذریعے بھارتی مسلمانوں کی حالت زار سے دنیا کو آگاہ کیا تھا اب خوش ونت سنگھ نے تنگ نظر بھارتی حکمرانوں کے چہرے کی نقاب کشائی کی ہے۔ اُمید ہے کہ یہ تحریریں قارئین کے لئے چشم کشا ثابت ہوں گی اور اس پروپیگنڈے کی قلعی کھول دیں گی کہ بھارت تو برصغیر میں امن چاہتا ہے مگر پاکستان اور بھارت کے علاوہ جموں وکشمیر میں بسنے والے بنیاد پرست مسلمان اپنی ماضی پرستی کی وجہ سے امن کی ان کوششوں کو کامیاب نہیں ہونے دیتے۔

ارشاد احمد عارف

سرائے درویش۔ 230 سی، مرغزار آفیسرز کالونی
ملتان روڈ، لاہور

17 مئی 2003ء

اظہاریہ

''بھارت کا خاتمہ'' منظرِ عام پر آتے ہی واجپائی کے دیس میں بھگدڑ مچ گئی، الزامات کے ''پرتھوی'' اور ''اگنی'' ایک بوڑھے دانشور پر برسنے لگے، ہوتے ہوتے گھر کی بات باہر نکلی اور عالمی ذرائع ابلاغ نے دبی زبان سے یہاں تک کہہ دیا کہ وہ بھارت کا نوم چومسکی ثابت ہوا ہے۔ ممکن ہے خوش ونت سنگھ کے کچھ مداحوں نے بھی ''اطلاعات کی سفید فام دنیا'' کے عطا کردہ اِس خطاب میں اپنے ممدوح کے لیے فخر کا کوئی پہلو دریافت کرلیا ہو لیکن میں تو ایسی کوئی کوشش کرنے پر بھی خود کو آمادہ نہیں کر پایا، کیونکہ دونوں میں بہت فرق ہے۔

چومسکی ایک ماہرِ لسانیات تھا اور اب بھی ہے۔ وہ انکار یہ اقرار اور اقرار یہ انکار کے دام بچھاتا ہے۔ عصرِ حاضر کی عدالت میں وہ سچائی کا وکیل تو نہیں بن پایا لیکن ایک کامیاب سفارتکار اب بھی بن سکتا ہے۔ اُس کا کردار ہمارے گاؤں کے اُس نمبردار جیسا ہے جو چودھری کی تازہ واردات کے متاثرین کو بیچ چوراہے کے بتاتا ہے کہ ''اعلیٰ حضرت نے پچھلے سال بھی چار آدمیوں کو گولیوں سے بھون دیا تھا، مجھے تو یوں لگتا ہے کہ وہ اپنے حواس سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ لہٰذا تمھیں چاہیے کہ.........''۔

لیکن خوشونت سنگھ ایسا نہیں ہے۔ وہ ماضی میں جاتا ہے لیکن حال کی بے حالی کے اسباب کی کھوج میں۔ تاکہ مستقبل کے ممکنہ حوادث کی روک تھام کے لیے زیادہ بہتر تدابیر اختیار کی جاسکیں۔ اپنے اِس طریقۂ کار کے تحت اُس نے جنونی ہندو ذہن کے خلیوں سے چمٹے ہوئے ''تباہ کن مدافعت'' کے تصور کو پوری طرح اُجاگر کیا ہے، جس کے محرکات ہزاروں سال قدیم تاریخ کے پاتال میں پوشیدہ ہیں۔ ''بھارت کا خاتمہ'' تحریر کرنے والا مصنف انتہا پسند ہندوؤں کا ''کتابی سفارتکار'' نہیں، کیونکہ وہ دوٹوک انداز میں رام کے اُن پجاریوں کو راون

کا حواری کہتا ہے جو بھارت کے گلی کوچوں میں ترشول بانٹتے پھرتے ہیں۔

وہ صدیوں پہلے بدھوں پر ہوئے مظالم پر بلکتا ہے، بدھ مت کی ''جلاوطنی'' پر تڑپتا ہے، مسلم عہد کے المیوں پر سسکتا ہے، گورے راج کے کالے کرتوتوں پر آہیں بھرتا ہے، آزادی کے لیے بہے خون پر آنسو بہاتا ہے اور خصوصاً آزادی کے بعد کی تلخیوں پر آہ وفغاں کرتا ہے ......لیکن پھر اُسے اپنے قارئین کا خیال آتا ہے تو کپکپاتے بوڑھے ہاتھوں سے آنسو پونچھ کر مسکرا دیتا ہے......اور نہایت ہمدردی سے گجرات جیسے عظیم المیوں کے اسباب بیان کرتا ہے، پھر ڈھارس بندھاتا ہے اور حل تجویز کرتا ہے، ساتھ ساتھ تنبیہہ بھی کرتا جاتا ہے کہ اگر مسلمانوں، عیسائیوں اور سکھوں کے سینوں کی طرف بڑھنے والے ترشولوں کا انسداد نہ کیا گیا تو یہ بھارتی پرچم کے تینوں رنگ چاٹ جائیں گے اور باقی صرف چکر رہ جائے گا...... پچھتاوے کا ایک دائروی سفر جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔

چومسکی کے شانے اتنا بوجھ نہیں اُٹھا سکتے کیونکہ مرض کی طوالت میں دلچسپی رکھنے والا طبیب مریض کو خوفزدہ یا خطرناک حد تک مرض سے لاپرواہ تو کر سکتا ہے لیکن چارہ گری نہیں۔

''بھارت کا خاتمہ'' میں تباہی کے خدشات ہیں تو ساتھ ہی بچاؤ کے راستے بھی تجویز کیے گئے ہیں۔ خوشونت سنگھ کی سبھی تجویزیں معقول ہیں ......لیکن انتہا پسند اور دہشت گرد تنظیموں کی حامی اور حمایت یافتہ موجودہ بھارتی حکومت کے لیے ایسی سبھی تدابیر اور تجاویز ناممکن العمل ہیں...... اِس لیے عین ممکن ہے کہ وہ سبق سیکھنے کی بجائے سبق سکھانے کی ہی پالیسی پر عمل پیرا رہے اور خوش ونت کی پیش گوئی سچ ثابت ہونے کے امکانات روشن ہونے لگیں......اس موضوع پر لکھنے کو اور بھی بہت کچھ ہے لیکن اب صفحہ مجھے آنکھیں دِکھا رہا ہے کہ میں قارئین اور خوش ونت سنگھ کے بیچ ایک سطر بھر بھی مزید نہ ٹھہروں......لہٰذا اجازت دیجیے اور اِس ننھی سی لیکن انتہائی اہم کتاب سے استفادہ کیجیے۔

خالد ارمان

نگارشات، 24۔ مزنگ روڈ، لاہور

مصنف کے بارے میں

خوش ونت سنگھ 1915ء میں ہڈالی، پنجاب میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور، کنگز کالج اور انر ٹیمپل لندن سے تعلیم حاصل کی۔
انہوں نے لاہور ہائی کورٹ میں کئی برس بطور وکیل پریکٹس کی اور 1947ء میں ہندوستان کی وزارت خارجہ میں ملازمت اختیار کر لی۔ انہیں کینیڈا اور لندن میں سفارتی عہدوں پر فائز کیا گیا، بعد ازاں انہوں نے پیرس میں یونیسکو میں خدمات انجام دیں۔
انہوں نے صحافی کی حیثیت سے اپنی غیر معمولی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز 1951ء میں آل انڈیا ریڈیو سے کیا۔ وہ ''یوجنا'' کے بانی مدیر تھے۔ انہوں نے ''دی السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا''، ''نیشنل ہیرالڈ'' اور ہندوستان ٹائمز کی ادارت کی ذمہ داریاں بھی ادا کیں۔ آج وہ ہندوستان کے معروف ترین کالم نویس اور صحافی ہیں۔
خوش ونت سنگھ ایک انتہائی کامیاب ادیب بھی ہیں۔ ان کی مطبوعہ کتابوں میں کلاسیک کا درجہ حاصل کر لینے والی دو جلدوں پر مشتمل THE HISTORY OF SIKHS کے علاوہ متعدد فکشن اور نان فکشن کتابیں شامل ہیں۔ ان کے ناول ''ٹرین ٹو پاکستان'' کو 1954ء میں بہترین ناول کا گروو پریس ایوارڈ ملا۔ ان کے دیگر ناولوں کے نام درج ذیل ہیں:

1- I SHALL NOT HEAR THE NIGHTINGALE

2- DELHI

3- THE COMPANY OF WOMEN

ان کتابوں کے علاوہ انہوں نے دہلی، فطرت (Nature) اور حالاتِ حاضرہ کے حوالے سے متعدد کتابوں کے تراجم بھی کئے ہیں۔

خوش ونت سنگھ 1980ء سے 1986ء تک پارلیمنٹ کے رکن رہے۔ انہیں ہندوستان کے صدر نے 1974ء میں پدم بھوشن کا اعزاز عطا کیا، جسے انہوں نے 1984ء میں مرکزی حکومت کی طرف سے گولڈن ٹیمپل امرتسر کے محاصرے پر احتجاج کرتے ہوئے واپس کر دیا۔

2002ء میں ان کی آپ بیتی:

TRUTH LOVE AND A LITTLE MALICE شائع ہوئی۔☆

☆"نگارشات" نے خوش ونت سنگھ کی اس انتہائی دلچسپ اور انکشاف انگیز آپ بیتی کو "سچ، محبت اور ذرا سا کینہ" کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ (مترجم)

تعارف

''بھارت بربادی کا شکار ہو چکا ہے اور کوئی معجزہ ہی بچائے تو بچائے ورنہ ملک ٹوٹ جائے گا۔۔۔1990ء تک آر ایس ایس کے اراکین کی تعداد دس لاکھ سے تجاوز کر چکی تھی جن میں دوسروں کے علاوہ اٹل بہاری واجپائی، ایل کے ایڈوانی، مرلی منوہر جوشی، اوما بھارتی اور نریندر مودی بھی شامل تھے۔۔۔میں نے ایڈوانی سے کہا: تم نے اس ملک میں نفرت کے بیج بوئے جن کا نتیجہ بابری مسجد کی شہادت کی صورت میں نکلا۔۔۔ ہر ہوش مند ہندوستانی کا فرض ہے کہ وہ ہندو جنونیوں کو تاریخ کے کوڑے دان میں پھینکے''۔۔۔ہم گجرات میں 'ہار' چکے ہیں''۔

تعارف

بھارت تاریک زمانے سے گزر رہا ہے۔ باپو گاندھی کی آبائی ریاست گجرات میں 2002ء کے اوائل میں ہونے والی قتل و غارت گری اور اس کے نتیجے میں نریندر مودی کی زبردست انتخابی فتح ہمارے ملک کو تباہی اور بربادی کے غار میں دھکیل دے گی۔ ہندو جنونیوں کا فاشسٹ ایجنڈا ہماری جدید تاریخ کے ہر تجربے سے مختلف ہے۔ تقسیم کے بعد میرا خیال تھا کہ ہم اس طرح کے قتل عام سے دوبارہ دوچار نہیں ہوں گے۔ مہان (عظیم) بننا تو دور کی بات ہے، بھارت بربادی کا شکار ہو چکا ہے اور کوئی معجزہ ہی بچائے تو بچائے ورنہ ملک ٹوٹ جائے گا۔ یہ پاکستان یا کوئی دوسری غیر ملکی طاقت نہیں ہو گی کہ جو ہمیں نیست و نابود کرے گی، بلکہ ہم خودکشی کریں گے۔

جب 1947ء میں ہندوستان نے آزادی حاصل کی تو کسی ہندوستانی نے اس خطرے کی پیش بینی نہیں کی تھی۔ ان کو تو بائیں بازو والوں کی فکر تھی۔ انہوں نے پیشگوئی کی تھی کہ کمیونسٹ چند برس کے اندر اندر ملک پر قبضہ کر لیں گے۔ تنگ نظر مارکسی پرچارک ہر اس شخص کو، جو ان کی بات پر کان دھرنے کی زحمت گوارا کرتا تھا، یہ یقین دلاتے تھے کہ ہندوستان ایک ایسا گلاسٹرا سیب ہے، جو ایک کٹی ہوئی شاخ سے لٹک رہا ہے اور ہلکی سی جنبش سے بھی ٹوٹ سکتا ہے۔ امیر اور مراعات یافتہ لوگ قلیل تعداد میں تھے جبکہ لاکھوں کروڑوں لوگ غریب، غیر مراعات یافتہ اور مجبور و مظلوم تھے۔ ان دونوں طبقات کے درمیان نابرابری اور عدم مساوات کی خلیج بہت زیادہ گہری اور وسیع ہو چکی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ کسان

اور محنت کش صدیوں پرانے جبر و استبداد کی زنجیریں توڑ ڈالیں گے اور امیر لوگوں کو سمندر کی بپھری ہوئی موجوں کے حوالے کر دیں گے۔ مستقبل میں مارکسی انقلاب برپا ہونے کے لیے کافی وشافی دلائل اور جواز موجود تھے۔ 1939ء سے 1945ء کے درمیانی عرصے میں، جو کہ دوسری عالمی جنگ کا زمانہ ہے، کانگرسی رہنما حکومت سے تعاون نہ کرنے کے جرم میں جیل کی سلاخوں کے پیچھے تھے اور کمیونسٹوں کو جو کہ فاشسٹوں کے خلاف برطانیہ اور اس کے اتحادیوں کی مدد کر رہے تھے، اپنی قوت میں اضافہ کرنے کی چھوٹ دے دی گئی تھی۔ انہوں نے پورے ملک میں محنت کشوں کی ٹریڈ یونینوں پر تسلط جما لیا اور کسان تنظیمیں قائم کیں، جنہوں نے زمینداروں سے اضافی زمینیں چھین لینے کا عزم اور عہد کیا ہوا تھا۔ ہر یونیورسٹی میں مارکسی طلباء یونین وجود میں آ چکی تھی، ترقی پسند ادیبوں کی تنظیمیں، عوامی تھیٹر گروپ اور ''احبابِ سوویت یونین'' (FRIENDS OF SOVIET UNION) جیسی تنظیمیں کام کر رہی تھیں۔ وہ بری، بحری اور فضائی افواج میں داخل ہو چکے تھے۔ انہیں بھرپور اعتماد و یقین تھا کہ جنگ ختم ہونے اور برطانیہ کے روانہ ہونے کی دیر ہے۔ وہ ملک کی باگ ڈور سنبھال لیں گے۔

ان کے سب اندازے غلط ثابت ہوئے کیونکہ انہوں نے عوام کے مزاج کو سمجھنے میں کوتاہی کی تھی۔ جونہی جنگ ختم ہوئی اور کانگرسی رہنماؤں کو رہائی ملی، عوام نے نفرت انگیز برطانیہ سے کمیونسٹوں کے ربط و تعاون پر انہیں ملامت کرنا شروع کر دیا۔ نیتا جی سبھاش چندر بوس اور کالعدم ''ہندوستانی قومی فوج'' (INDIAN NATIONAL ARMY) کے دوسرے رہنما عوام کے نئے ہیرو بن گئے، جنہوں نے جاپان کی طرف سے برطانیہ سے جنگ لڑی تھی۔ کمیونسٹوں نے ہندوستانی عوام پر مہاتما گاندھی کی گرفت کا بھی غلط اندازہ لگایا تھا۔ مہاتما گاندھی بھگوان کو نہ ماننے والے کمیونسٹوں کے لئے کوئی ہمدردی نہیں رکھتے تھے۔ سب سے بڑھ کر ہندوستان کے پہلے وزیراعظم نہرو نے ہندوستان کو ایک سوشلسٹ ملک بنا کر کمیونسٹوں کے غبارے سے ہوا نکال دی۔ کمیونسٹوں نے جو قوت اکٹھی کی تھی، وہ زائل

ہو چکی تھی۔ ایک مرتبہ کنگسلے مارٹن نے، جو کہ بائیں بازو کے ''نیو سٹیٹسمین'' اور ''نیشن'' کے مدیر اور نہرو کے دوست تھے، ہندوستان کے ایک دورے میں مجھے کہا: ''میرے عزیز دوست! آپ ہندوستانی کمیونسٹوں کو سنجیدگی سے کس طرح لے سکتے ہیں؟ وہ تو کمیونسٹ دشمنوں کی کرکٹ ٹیموں کے ساتھ میچ کھیلتے ہیں!''

اس کے ساتھ ساتھ ایک نیا خطرہ دھیرے دھیرے مگر یقینی طور پر فروغ پاتا جا رہا تھا۔ نہرو اس دور کے پہلے اور شاید واحد ہندوستانی رہنما تھے جنہیں ادراک تھا کہ کمیونزم ہندوستانی جمہوریت کو چیلنج نہیں کرے گا بلکہ یہ چیلنج تو مذہبی جنونیت کے احیا سے درپیش ہو گا۔ انہوں نے جیل میں گزرے ہوئے اپنے نو برسوں کا اچھا خاصا حصہ ہندوستانی اور عالمی تاریخ کے مطالعے میں گزارا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ہر منظم دھرم ایک تخیلاتی عظیم الشان ماضی کی پرستش اور تبدیلی کی مخالفت کرتا ہے۔ یورپ میں سیکولر قوتوں کو چرچ کے ساتھ جنگیں لڑنا پڑیں اور اسے اپنی سرگرمیوں کا دائرہ روحانی معاملات تک محدود رکھنے پر مجبور کرنا پڑا۔ اسلامی دنیا میں ایسا نہیں ہوا۔ نتیجتاً مسلمان قومیں پس ماندہ اور بہت حد تک غیر جمہوری رہیں۔ ہندو اکثریت والے ہندوستان کا کیا بنے گا، اب وہ صدیوں میں پہلی مرتبہ حقیقتاً آزاد ہوا تھا؟ ہندوستانی جمہوریت آبگینوں کی طرح نازک تھی اور جب تک اس کی سیکولر جڑیں مضبوط نہیں ہوتیں، اس کے ٹوٹ گرنے کے خدشات بہت زیادہ تھے۔ ہندوستان میں اقلیتیں بھی موجود تھیں۔ مسلمان بارہ فیصد، عیسائی تین فیصد اور ان سے زیادہ سکھ تھے۔ مسلمان اور عیسائی پورے ملک میں بکھرے ہوئے تھے اور ان کا مسائل کھڑے کرنا یقینی نہیں تھا۔ سکھ پنجاب میں مرتکز ضرور تھے مگر ان کی تعداد قلیل تھی۔ ہندوؤں سے ان کا تعلق بہت نزدیکی تھا اس لئے انہیں قابو کیا جا سکتا تھا۔ ہندوستان کی سیکولر جمہوریت کے لئے بڑا خطرہ ہندوؤں میں، جو کہ آبادی کا اسی (80) فیصد تھے۔ مذہبی بنیاد پرستی کا احیا تھا۔ یاد رہے کہ جب ڈاکٹر راجندر پرشاد سومنات کے نوتعمیر شدہ مندر کا افتتاح کرنے پر راضی ہو گئے تو نہرو نے انہیں شدید احتجاجی مراسلہ بھیجا کہ ایک سیکولر ریاست کے سربراہ کو مذہبی

معاملات سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہیے۔ بدقسمتی سے نہرو کے بعد آنے والے رہنما ان کی طرح دیانتدار، مخلص اور سرگرم سیکولر نہیں تھے۔ یوں ہندو انتہا پسند گروہ تقویت پانے لگے۔ پورے ہندوستان میں نوجوانوں کے ذہنوں میں مذہبی جنونی تصورات کا زہر بھرا جانے لگا۔ انہیں مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے خلاف لڑنے اور ان کا قتل عام کرنے کے لیے جنگی تربیت دی گئی۔ مسلح گروہ قائم ہو گئے جو معصوم اور نہتے شہریوں کو ہراساں کرتے رہتے تھے۔ تعلیمی اداروں، انتظامیہ، فوج اور صحافت میں ہندو مذہبی جنونی داخل ہونے لگے۔ ہندوستانی حکمران اپنے مفادات پورے کرنے کے چکر میں رہے اور ہندوستان ہندو جنونیت کی دلدل میں دھنستا چلا گیا۔

ہندو انتہا پسندوں نے عام ہندوؤں کے ذہنوں میں یہ احساس راسخ کر دیا کہ انہیں غیر ملکیوں نے صدیوں تک لوٹا کھسوٹا اور ان کی تذلیل کی ہے۔ مسلمان تقریباً آٹھ سو سال تک ہندوستان پر حکمران رہے تھے۔ ہندو انتہا پسندوں نے الزام لگایا کہ مسلمان بادشاہوں نے ہندوؤں کے مندروں کو مسمار کروا دیا تھا، ہندوؤں کو جبراً مسلمان بنایا تھا اور غیر مسلموں کو جزیہ لگا دیا تھا۔ حالانکہ مسلمان حکمرانوں ہی پر یہ الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ تمام قدیم اور وسطی زمانے کے معاشروں میں ایسا عموماً ہوا کرتا تھا، مثال کے طور پر پرانے ہندو بادشاہوں اور راجاؤں نے بھی بدھوں اور جینوں کا قتل عام کروایا اور ان کی پرستش گاہوں (PLACES OF WORSHIP) کو مسمار کروا دیا۔ مغلوں کے بعد ہندوستان پر حکومت کرنے والے برطانویوں نے نہ صرف ہندوؤں اور مسلمانوں کو یکساں طور پر ظلم و ستم کا نشانہ بنایا بلکہ عیسائی مشنریوں کو چھوٹ دی کہ وہ پورے ہندوستان میں سکول، کالج اور ہسپتال کھولیں، بائبل کی تعلیمات کا پرچار کریں اور لوگوں کو عیسائی بنائیں۔

برطانوی دورِ حکومت ہی میں ہندو قوم پرستی نے جنم لیا۔ انتہائی طاقتور تحریک ''آریہ سماج'' سوامی دیانند سرسوتی (1883ء۔1824ء) کی رہنمائی میں شروع ہوئی۔ اس کے ''ویدوں کی طرف واپسی'' کے نعرے کو زبردست قبولیت حاصل ہوئی اور شمالی ہندوستان

میں تو اس نظریئے کو بالخصوص قبولیت حاصل ہوئی۔"آریہ سماج" کے ماننے والوں میں ایک پنجابی لالہ لاجپت رائے (1865ء۔1928ء) بھی تھا، جو کہ ایک کٹڑ ہندو اور انڈین نیشنل کانگرس کا رکن بھی تھا۔ مہاراشٹر کے بال گنگا دھر تلک (1856ء۔1920ء) کا معاملہ بھی ایسا ہی تھا۔ اس نے گن پتی کے مسلک کا احیا کیا اور "سوراج (آزادی) ہمارا پیدائشی حق ہے" کا نعرہ وضع کیا۔ ادھر مسلح ہندو تنظیمیں وجود میں آ چکی تھیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہم راشٹریہ سیوک سنگھ (آر ایس ایس) تھی۔ اس کی بنیاد 1925ء میں کیشو بلی رام ہجوار (1889ء۔1940ء) نے ناگپور میں رکھی تھی۔ اس نے ایک ہندو راشٹر یعنی ہندو ریاست کے نظریئے کا پرچار کیا۔ وہ مسلمانوں کا دشمن تھا۔ وہ مہاتما گاندھی کا بھی مخالف تھا، کیونکہ مہاتما گاندھی تمام مذاہب کے مساوی حقوق کے لیے جدوجہد کرتے تھے۔ کیشو بلی رام کا جانشین ایم۔ایس۔ گول واکر تھا، جس کا جانشین بالا صاحب دیوراس تھا۔ ان سب رہنماؤں نے، جو کہ کرشماتی لیڈر تھے اور شرمناک حد تک فرقہ پرست تھے، آر ایس ایس کو فاشسٹ پروپیگنڈے کے ذریعے مضبوط کیا۔ انہوں نے آر ایس ایس میں سخت نظم وضبط قائم رکھا اور زلزلوں اور قحط جیسے المیوں اور تقسیم کے دوران ہندوؤں میں نہ صرف سماجی فلاح کے کام کئے بلکہ دورانِ تقسیم تو انہوں نے ہزاروں بے بس مسلمان بچوں، بوڑھوں، عورتوں اور نہتے جوانوں کو بے دردی کے ساتھ قتل کر دیا، اور ان کے اثاثے لوٹ لئے۔

1990ء تک آر ایس ایس کے اراکین کی تعداد دس لاکھ سے تجاوز کر چکی تھی، جن میں دوسروں کے علاوہ اٹل بہاری واجپائی، ایل کے۔ ایڈوانی، مرلی منوہر جوشی، اُوما بھارتی اور نریندر مودی بھی شامل تھے۔ اُوما بھارتی، ایل۔ کے ایڈوانی اور مری منوہر جوشی تو 6 دسمبر 1992ء کو بابری مسجد شہید کرنے کے نامزد ملزم ہیں۔ نریندر مودی نے گجرات میں مسلمانوں کا منظم قتل عام کروایا ہے۔ آر ایس ایس مسلمانوں، عیسائیوں اور بائیں بازو والوں کی دشمن تھی اور ہے۔ جب تک وہ مرکزی دھارے کی سیاست کے کناروں پر تھی تو اسے جنونی قرار دے کر نظر انداز کیا جا سکتا تھا، تاہم اب ایسا نہیں ہو سکتا۔ آر ایس ایس کی

بغل بچہ بھارتیہ جن سنگھ کے، جو آج بھارتیہ جنتا پارٹی کہلاتی ہے، 1984ء میں لوک سبھا میں صرف دو رکن تھے لیکن 1991ء میں لوک سبھا میں اس کے اراکین کی تعداد 117 ہو گئی۔ آج یہ اپنے اتحادیوں کے ساتھ ملک پر حکومت کر رہی ہے۔

اب آر ایس ایس سے زیادہ نہیں تو اس جتنی عسکریت پسند کئی مزید ہندو تنظیمیں وجود میں آ چکی ہیں۔ ایسی ہی ایک تنظیم شیو سینا ہے، جس کا رہنما بال ٹھاکرے ہے۔ وہ ایڈولف ہٹلر کا مداح ہے۔ اس نے ''مہاراشٹر مہاراشٹریوں کا ہے'' نامی تحریک کے ذریعے اپنی جنونیت پسندانہ سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ مذکورہ تحریک کا مقصد بمبئی ☆ سے جنوبی ہندوستانیوں کو نکالنا تھا۔ اب اس کا مشن مسلمانوں کو ہندوستان سے نکالنا ہے۔ گزشتہ دہائی میں اس نے اپنی جڑیں پورے ملک میں پھیلا لی تھیں اور اس کے ''فوجیوں'' (سینکوں SAINIKS) نے ایودھیا میں بابری مسجد کو شہید کرنے میں مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ شاید اسی ''کارنامے'' کے انعام میں اسے مرکزی حکومت میں متعدد وزارتیں دی گئی ہیں۔ شیو سینا سے بھی زیادہ شر انگیز اور فتنہ پرور تنظیمیں بجرنگ دَل اور وِشو ہندو پریشد ہیں۔ یہ تنظیمیں آج کل ہندوستان میں احتجاجی تحریک چلا رہی ہیں، جس کا مقصد اب شہید بابری مسجد کی جگہ رام جنم بھومی تعمیر کرنا ہے۔ انہیں حکومت یا عدلیہ کی کوئی پرواہ نہیں ہے کہ وہ اس معاملے میں کیا کہتی ہیں۔ یہ ان کی خاصیت ہے۔ توسیع شدہ سنگھ پریوار کے بیشتر اراکین اپنے آپ کو ملکی قانون سے بالاتر تصور کرتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو ایک ارب ہندوستانیوں کی تقدیر کا فیصلہ کرنے والا سمجھتے ہوئے تکبر کا شکار ہیں۔

☆☆☆

ہم ہندوستانی پیدائشی طور پر جس نسل، مذہب اور ذات سے تعلق رکھتے ہیں، ہمیشہ اس کو ہندوستانی قومیت پر ترجیح دیتے آئے ہیں۔ جب سے بی جے پی اور اس کے اتحادی

☆ ہندو جنونیوں نے بمبئی کا نام ممبئی رکھ دیا ہے اور وہ اسے ممبئی ہی کہنے پر اصرار کرتے ہیں۔ خوش ونت سنگھ نے بمبئی ہی استعمال کر کے ہندو انتہا پسندی کی پیروی سے عملاً انکار کیا ہے۔ (مترجم)

اقتدار میں آئے ہیں، اس وقت سے علیحدگی کے احساس میں ایک شرانگیز جہت کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اس بات پر یقین کرنا دشوار ہے کہ سنگھ پریوار کے گماشتے ہندوؤں کی ایک اچھی خاصی تعداد کو، جو کہ ملکی آبادی کا بیاسی فیصد ہیں، یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گئے ہیں کہ ان کے ساتھ دوسرے درجے کے شہریوں والا برتاؤ کیا جاتا رہا ہے۔ یہ احساس کمتری کس وجہ سے ہے؟ نریندر مودی، پراوین توگاڈیا، اشوک سنگھل اور گری راج کشور جیسے لوگ کس طرح ہندوؤں کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہوئے کہ ان کے ساتھ امتیاز برتا گیا ہے، جبکہ ان کے دعوے کو ثابت کرنے والے شواہد ہی موجود نہیں؟

ہندو بنیاد پرستی کا جگن ناتھ عدم رواداری کے مندر اور اس کی یاترا سے نمودار ہوا ہے۔ اس کے راستے میں جو بھی آئے گا، وہ اس کے بھاری پہیوں تلے کچلا روندا جائے گا۔ ہم فخر کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ ہندومت تو سب مذہبوں کے ساتھ مصالحت کرنے والا دھرم ہے اور ہندوستان، جو کثیر ہندو آبادی والا ملک ہے، اقلیتوں کے ساتھ برتاؤ کے حوالے سے دنیا کی تمام قوموں میں سب سے زیادہ روادار ہے۔ سوامی ویویک آنند، سری انو بندو، جدو کرشنا مورتی، سوامی پربھو پد اور اوشو جیسے ہندو ساونت اور ''رام کرشنا مشن'' کے سادھو ہندومت کا پیغام دوسرے ملکوں میں لے گئے، انہوں نے مندر تعمیر کئے اور بے شمار لوگوں کو ہندو بنایا۔ دنیا کے پہلے سب سے بڑے مذہب عیسائیت اور دوسرے سب سے بڑے مذہب اسلام کے پیروکار اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہندومت ایک ایسا منفرد مذہب ہے، جو اپنے پیروکاروں کو چھوٹ دیتا ہے کہ وہ ہستی کی صداقت تک مختلف طریقوں اور راستوں سے پہنچ سکتے ہیں اور ہر شخص کو حق ہے کہ وہ بھگوان کو اپنے اپنے طریقے سے پالے۔ یہ روحانی معاملات پر اجارہ داری کا دعویٰ نہیں کرتا اور ادعا پسندی اور تعصب سے خالی ہے۔ حالیہ برسوں میں اس تاثر کو شدید ٹھیس لگی ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ امتیاز بابری مسجد کی شہادت کے ساتھ اپنی انتہا کو پہنچ گیا اور پھر گجرات میں ہندو دہشت گردوں نے مسلمانوں کا قتل عام کر کے اس تصور کو تباہ کر ڈالا کہ ہندومت ایک زیادہ روادار دھرم ہے۔ عیسائی

مشنریوں کے قتل، گرجا گھروں اور سکولوں پر حملوں اور بائبل کو نذرِ آتش کرنے سے عیسائیوں میں بھی ہندومت کے تاثر کو ایسا ہی نقصان پہنچا ہے۔

ہر مذہب کا بدترین دشمن وہ جنونی ہوتا ہے، جو اس کی پیروی کا جھوٹا دعویٰ کرتا ہے اور اپنے عقیدے کے ذاتی تصور کو دوسروں پر ٹھونسنے کی کوشش کرتا ہے۔ لوگ مذاہب کے بارے میں ان کے پیغمبروں کی تعلیمات یا ان کے طرزِ زیست سے نہیں بلکہ ان کے پیروکاروں کے عمل سے فیصلہ کرتے ہیں۔ عیسائیت کو اپنے محتسبوں کے بارے میں صفائی پیش کرنے میں بڑی مشکل اٹھانا پڑی تھی، جنہوں نے اپنے ہم مذہب عیسائیوں کے علاوہ مسلمانوں اور دیگر مذاہب کے ماننے والوں پر غیر انسانی ظلم وستم روا رکھے تھے۔ اور اب ہندومت کے بارے میں اوما بھارتی، سادھوی رتھمبر اور پراوین توگاڈیا جیسے لوگوں کی تقریروں اور دارا سنگھ، نریندر مودی اور بال ٹھاکرے جیسے لوگوں کے عمل کے پیش نظر فیصلہ کیا جائے گا۔

فاشزم ہمارے ملک میں اپنی جڑیں مضبوط کر چکا ہے۔ اس کا الزام ہم صرف خود ہی کو دے سکتے ہیں۔ ہمی نے جنونیوں کو کسی احتجاج کے بغیر اپنی انتہا پسندانہ سرگرمیاں جاری رکھنے کا موقع دیا۔ انہوں نے اپنی ناپسندیدہ کتابوں کو جلایا، انہوں نے اپنے مخالف صحافیوں کو مارا پیٹا، انہوں نے اپنی ناپسندیدہ فلمیں دکھانے والے سینماؤں کو جلایا، انہوں نے حکومت کے منظور شدہ سکرپٹ کو فلمانے والوں کے آلات کو توڑا پھوڑا۔ انہوں نے ایک ممتاز مسلمان مصور کے سٹوڈیو میں بدمعاشی کی اور ان کی تصاویر کو تباہ کر دیا، انہوں نے تاریخ کی کتابوں کو اپنے نظریات کے مطابق ڈھالنے کے لیے ان کے متن میں تحریف کی۔ ہم نے انہیں یہ سب کچھ کرنے کی چھوٹ دی، گویا ہمیں اس سے کوئی سروکار ہی نہ ہو۔ اب وہ صرف اس جرم میں لوگوں کو ذبح کر رہے ہیں کہ وہ ایک مختلف خدا کو مانتے ہیں۔ وہ اپنے سے اختلاف کرنے والے ہر شخص سے گالم گلوچ کرتے ہیں۔ ہم ان کے لئے جعلی سیکولر ہیں۔ ہم جوابی حملہ کرنے میں ناکام ہوئے ہیں، کیونکہ ہم نے اپنی قوت مجتمع نہیں کی اور

اپنے ملک کو ان جنونیوں کے ہاتھوں میں جانے دینے کے خطرات کا ادراک نہیں کیا۔ ہم اپنی اس کوتاہی کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔

گیتا ہری ہرن نے اپنے ناول IN TIMES OF SIEGE میں ایک جرمن پادری ریورنڈ مارٹن نیمولر کا حوالہ دیا ہے، جسے نازیوں نے سزائے موت دے دی تھی:

''جرمنی میں پہلے وہ کمیونسٹوں کے خلاف حرکت میں آئے اور میں نے آواز نہیں اٹھائی کیونکہ میں کمیونسٹ نہیں تھا۔
پھر انہوں نے یہودیوں کے خلاف اقدام کیا اور میں نے آواز نہیں اٹھائی کیونکہ میں یہودی نہیں تھا۔
پھر انہوں نے ٹریڈ یونینوں کا قلع قمع کیا اور میں نے آواز نہیں اٹھائی کیونکہ میں ٹریڈ یونینسٹ نہیں تھا۔
پھر انہوں نے ہم جنس پرستوں کو نیست و نابود کیا اور میں نے آواز نہیں اٹھائی کیونکہ میں ہم جنس پرست نہیں تھا۔
پھر انہوں نے کیتھولکوں پر ظلم وستم کیے اور میں نے آواز نہیں اٹھائی کیونکہ میں پروٹسٹنٹ تھا۔
پھر انہوں نے میرا رُخ کیا۔۔۔ مگر اس وقت کوئی بچا ہی نہیں تھا جو میرے لیے آواز اٹھاتا۔''

میں اپنی مدافعت میں صاف ضمیر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جب کبھی مذہبی بنیاد پرستی اور جنونیت ابھری میں نے اس کے خلاف لازماً آواز اٹھائی۔ جب جرنیل سنگھ بھنڈرانوالہ نے ہندوؤں کے خلاف نفرت بھری تقریریں کیں تو میں نے اس کی مذمت کی۔ میں اس کی اور خالصتانیوں کی ہٹ لسٹ (Hit List) پر تھا اور مجھے پندرہ برس تک زیر حفاظت رہنا پڑا۔ کانگرس کی حقیقت سے آشنا ہونے کے بعد میں نے 1989ء میں نئی دہلی سے رکن پارلیمنٹ کے لئے ایل۔ کے۔ ایڈوانی کا نام دیا تھا مگر جب اس نے سومنات سے ایودھیا

تک اپنی بدنام رتھ یاترا شروع کی تو میں نے اُسے بھی نہیں بخشا۔ ایک مرتبہ ایک عوامی جلسے میں میرا اور اس کا سامنا ہو گیا۔ میں نے اس کے منہ پر کہا: ''تم نے اس ملک میں نفرت کے بیج بوئے، جن کا نتیجہ بابری مسجد کی شہادت کی صورت میں نکلا۔''

اب اپنے کالموں کے جواب میں مجھے ہندو بنیاد پرستوں کی طرف سے نفرت آمیز خط موصول ہو رہے ہیں۔ کوئی ہفتہ ایسا نہیں گزرتا جب مجھے کوئی ایسا خط یا پوسٹ کارڈ نہ موصول ہوتا ہو جس میں مجھے سکھ مت اور ہندوستان کے لئے لعنت نہ قرار دیا گیا ہو یا پاکستانی ایجنٹ نہ لکھا گیا ہو۔۔۔ ''پاکستانی رنڈی کی اولاد'' ☆ اس کے علاوہ اور بھی ایسی ایسی گالیاں لکھی ہوتی ہیں جو کہ ناقابلِ اشاعت ہیں۔ مجھ پر اس گندے پانی کی بارش کا ذرا بھی اثر نہیں ہوتا۔ میں نہ تو پہلے اپنی روش سے ہٹا ہوں اور نہ آئندہ ہٹوں گا کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ میرے ملک کی طرف سے مجھ پر فرض ہے کہ میں جب تک ممکن ہو، ان شر کی طاقتوں کے ساتھ لڑتا رہوں۔

میں اپنے منہ میاں مٹھو نہیں بن رہا۔ میں کوئی سورما نہیں ہوں۔ میں تو بزدل سا بندہ ہوں تاہم جب میرے سامنے میرے ملک کے حقیقی دشمن ہوں تو میں اپنے خیالات کا بے خوف ہو کر اظہار ضرور کرتا ہوں۔ یہ کم سے کم ہے جو میں کر سکتا ہوں، ایک طویل عرصے سے میں مذہبی بنیاد پرستی کے لئے ایک موزوں لفظ کو تلاش کر رہا ہوں، آخر کار میں نے اسے گیتا ہری ہرن کے ناول میں پا لیا۔ وہ انہیں ''فنڈوز'' (FUNDOOS) کہتی ہے اور ان کی بالکل درست تعریف یوں متعین کرتی ہے:

> ''فنڈو ایک عرفیت ہے، جسے بینا روانی سے ادا کرتی ہے۔ ایک پالتو کے لئے، ایک پالتو دشمن کے لئے ایک عرف۔ شناسا گارڈن ورائٹی نفرت پھیلانے والا، جس سے بچنا محال ہے کیونکہ وہ تمہارے اپنے

☆ ہم نے بہ امر مجبوری اس جملے کو ترجمہ کیا ہے۔ چونکہ اس کتاب کا مقصد ہندو انتہاپسندوں اور جنونیوں کی ذہنی غلاظت کو عیاں کرنا ہے لہٰذا ہم دکھے دل کے ساتھ اُنہیں جوں کا توں پیش کر رہے ہیں۔ (مترجم و ناشر)

عقبی صحن میں جڑ پکڑ چکا ہے۔ فنڈو، فنڈامینٹلسٹ۔ فاشسٹ۔ تاریکی پھیلانے والے۔ دہشت گرد۔ اور میڈان انڈیا برانڈ، فرقہ پرست۔۔۔ دوسری کمیونٹی سے نفرت کرنے والے پیشہ وروں کا فریب کارانہ بے ضرر نام۔"

جب میں نے محسوس کیا کہ ہم "فنڈوز" کے خلاف جنگ ہار چکے تو شدید ذہنی کرب، غصے اور مایوسی کے عالم میں اس کتاب میں شامل مضامین کو لکھا۔ ہم گجرات میں ہار چکے ہیں، ہوسکتا ہے ہم کچھ دوسری ریاستوں میں ہار جائیں اور "فنڈوز" زبانی کلامی سیکولرازم کا ذکر کرتے ہوئے۔۔ یا تو یہ ہے کہ اس کے بغیر بھی۔۔۔ ہم پر حکومت کر سکتے ہیں۔ تاہم مجھے اب بھی امید ہے کہ ان کے خلاف ذہنی انقلاب برپا ہوگا، لوگ ان سے برگشتہ ہوں گے اور بالآخر انہیں تاریخ کے کوڑے دان میں پھینک دیا جائے گا، جہاں سے کہ ان کا تعلق ہے۔ ہر ہوش مند ہندوستانی کا فرض ہے کہ وہ ہندو جنونیوں کو تاریخ کے کوڑے دان میں پھینکے۔

خوش ونت سنگھ

فروری 2003ء

☆☆☆

گجرات کا مقدمہ

"یہ امر واضح ہے کہ گودھرا میں ٹرین پر حملہ پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق ہوا تھا۔ ملزموں سے آہنی ہاتھوں سے نمٹنے کی بجائے حکومت شرانگیزوں سے مل گئی اور اس کی پولیس اور وزیر اعلیٰ بدلے اور انتقام کے جنون میں مبتلا ہو گئے۔ ۔۔۔انتقام انتہائی شیطانی اور مؤثر تھا"۔

گجرات کا مقدمہ

ایسے دن بھی آتے ہیں جب میں اپنے نیتاؤں اور نام نہاد سنتوں کی
تقریروں کو سنتا ہوں تو مایوسی مجھ پر اس قدر غلبہ پا لیتی ہے کہ میرے
اندر سے ایک چیخ ابھرتی ہے: ''جہنم میں جائیں یہ سب۔ میں ان کی
بکواسیات پر مضطرب ہو کر اپنی زندگی کیوں برباد کروں۔''
جب میں ڈپریشن پر غلبہ پا لیتا ہوں تو میرے اندر غصے کی ایک لہر
ابھرتی ہے اور میں اپنے آپ سے کہتا ہوں: ''یہ میری مادرِ وطن ہے،
میں عہد وسطیٰ کی ذہنیت والے ان جنونیوں کو کسی مندر کی درست جگہ
بنیاد رکھنے کے لایعنی جھگڑے میں بیش قدر برس ضائع کرنے میں
کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ میں تو کھلم کھلا چیخ چیخ کر احتجاج کروں
گا۔''

اور اب ہندو جنونیوں نے گجرات میں معصوم اور نہتے مسلمانوں کا قتل عام کیا ہے۔
2002ء کے بلوؤں کے بارے میں بہت کچھ لکھا اور کہا جا چکا ہے۔ میں ایک پرانی
دستاویز کا حوالہ دینا پسند کروں گا۔ جج میڈن نے 1970ء میں بھیونڈی اور جل گاؤں میں
ہونے والے فسادات کے بعد مہاراشٹر حکومت کے لیے اپنی رپورٹ کے آخر میں لکھا تھا:

''یہ نفرت اور تشدد، تعصب اور دروغ حلفی کی سرزمین پر ایک تنہا،
مشقت طلب اور تھکا دینے والا سفر تھا۔ راستے میں ملنے والے لوگ

شقی القلب اور انسانوں کے خون کے پیاسے تھے۔ اس سفر میں وہ
سیاستدان ملے جو فرقہ ورانہ نفرت اور مذہبی جنونیت کا دھندا کرتے
ہیں، ایسے مقامی رہنما ملے جو تفرقے اور تلخی کے بیج بو کر اقتدار تک
رسائی پاتے ہیں، ایسے پولیس افسر اور سپاہی ملے جو اپنی وردی کی
حرمت نہیں کرتے تھے، بے ضمیر تفتیش کار افسر ملے، جھوٹ اور فریب
کاری پر کاربند لوگ اور قتل و خونریزی کا بیوپار کرنے والے ملے۔''

شاید وہ نریندر مودی کے گجرات کے حوالے سے لکھ رہا تھا۔ تاہم کم از کم ایس۔ بی۔
چاون کی مہاراشٹر حکومت نے جج میڈن کی رپورٹ کو اس کی تمام تجاویز و سفارشات سمیت
قبول کر لیا تھا۔ مودی کی حکومت نے تو قومی انسانی حقوق کمیشن کی رپورٹ کو نادرست اور
متعصبانہ قرار دے کر رد کر دیا ہے۔ مرکزی حکومت کا طرزِ عمل بھی کوئی مختلف نہیں تھا۔ ارون
جیٹلے جیسے وزیروں نے شرمناک انداز میں مودی کے موقف کی تائید کی۔ ان کے مطابق یہ
جعلی سیکولر لوگوں کا محض پروپیگنڈا تھا۔

انسان کسی ایسی حکومت سے کیا توقع کر سکتا ہے جو کہ کھلم کھلا قاتلوں کی حمایت کر چکی
ہو؟ یہ امر واضح ہے کہ گودھرا میں ٹرین پر حملہ پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق ہوا تھا۔
ملزموں سے آہنی ہاتھوں سے نمٹنے کی بجائے حکومت شرانگیزوں سے مل گئی اور اس کی پولیس
اور وزیراعلیٰ بدلے اور انتقام کے جنون میں مبتلا ہو گئے۔ یہ امر بھی واضح ہے کہ انتقام انتہائی
شیطانی اور مؤثر تھا کیونکہ اس کا منصوبہ بھی پہلے بنا لیا گیا تھا۔ باوثوق رپورٹیں موجود ہیں کہ
گودھرا والے واقعے کے بعد چند گھنٹوں کے اندر اندر گجرات کے مختلف حصوں میں مسلح گروہ
سڑکوں پر نکل آئے تھے اور ان کے پاس مسلمانوں کے گھروں اور املاک کی فہرستیں تھیں۔
سینکڑوں مسلمانوں کو شدید زدوکوب کر کے قتل کر دیا گیا یا زندہ جلا دیا گیا، مسلمان عورتوں کی
آبروریزی کی گئی، گھروں اور دکانوں کو لوٹا اور جلایا گیا۔ میں پہلے بھی 1947ء اور 1984ء
میں اپنی آنکھوں کے سامنے یہ سب ہوتے دیکھ چکا ہوں۔ پولیس قتل عام کو ''تماش بینوں''

کی طرح دیکھتی رہی تھی۔ یقیناً انہیں حکم دیا گیا تھا کہ وہ مداخلت نہیں کریں بلکہ لٹیروں اور قاتلوں کو بے بس مردوں، عورتوں کو ایسا سبق سکھانے دیں کہ جسے وہ کبھی فراموش نہیں کر سکیں۔

گجرات میں وہ اس سے کئی قدم آگے چلے گئے۔ پولیس صرف بے حرکت ہی نہیں رہی۔ بلکہ جب فوج پہنچی تو پتا چلا کہ پولیس بھیجی ہی نہیں گئی تھی۔ فلیگ مارچ اتنے مضحکہ خیز تھے کہ انہوں نے شرانگیزوں پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ انہیں صرف یہ احکامات ڈرا سکتے تھے کہ شر انگیزوں کو دیکھتے ہی گولی ماردی جائے مگر یہ احکامات بہت تاخیر سے جاری کیے گئے۔ اس وقت تک سینکڑوں نہتے اور بے بس مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتارا جا چکا تھا اور ان کے اثاثے لوٹ کر ان کی جائیدادوں کو نذرِ آتش کیا جا چکا تھا۔ جن افسروں نے اپنا فرض ادا کرنے کی کوشش کی اور دہشت گردوں کے منصوبوں میں رخنہ اندازی کی، ان کا تبادلہ کر دیا گیا۔ حد تو یہ تھی کہ بلوؤں کے متاثرین کے لئے بنائے گئے کیمپوں میں بھی خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔

اس امر میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ وزیراعلیٰ، اس کے ساتھی وزراء اور آئی جی پولیس نے اپنے فرائض ادا کرنے میں کوتاہی کی۔ فسادات ہوئے سال ہو چلا ہے مگر بے شمار مسلمان بے گھر ہیں۔ جو مسلمان اپنے گھروں کو لوٹ چکے ہیں، انہیں مجبور کیا گیا کہ وہ پولیس میں درج کردہ تمام شکایات واپس لے لیں۔ وہ اپنے ہندو ہمسایوں کے رحم و کرم پر ہیں جنہوں نے انہیں خبردار کر دیا ہے کہ وہ اپنی ماتحت حیثیت کو کبھی فراموش مت کریں۔ اگر گجرات کے مسلمانوں پر مذہبی ٹیکس لگا دیا جائے تو مجھے کوئی حیرت نہیں ہوگی۔

☆☆☆
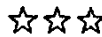
ستم ظریفی تو یہ ہے کہ مسلمانوں اور عیسائیوں پر تشدد کے بدترین واقعات گجرات میں ہوئے ہیں، جو کہ باپو گاندھی کی آبائی ریاست ہے۔ ایسا برسوں سے ہو رہا ہے۔ 2002ء کے فسادات سے پہلے ریاست کے قبائلی علاقوں میں عیسائی مشنریوں پر حملے ہوئے تھے۔

ہر روز حملوں اور ڈرانے دھمکائے جانے کی خبریں آ رہی تھیں۔ ہم ایسی خبریں آئندہ بھی سنیں گے۔

1990ء کی دہائی کے اواخر سے اخبارات اس فرقہ واریت کا الزام سنگھ پریوار کے نئے فاشسٹ اراکین کو دے رہے تھے یعنی آر ایس ایس، وشو ہندو پریشد، بجرنگ دل اور شیوسینا مع بی جے پی کی حکومت کے۔ اقلیتی کمیشن کی رپورٹ نے قومی اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں کی توثیق کر دی۔ جو لوگ دلچسپی رکھتے ہوں ان کے لئے تباہ شدہ گرجا گھروں، درگاہوں، مسلمانوں کے گھروں اور دکانوں کی تصویری شہادت دستیاب ہے۔ سب سے زیادہ مہمل ریاست کی حمایت سے کی جانے والی یہ کوشش ہے کہ مسلمانوں کی یادگاروں کو نیست و نابود کر دیا جائے۔ میں نے پہلی مرتبہ اس کا مشاہدہ 1998ء میں کیا۔ گجرات کے دارالحکومت احمد آباد کو عہد وسطیٰ میں ایک مسلمان حکمران نے آباد کروایا تھا۔ میں نے دیکھا کہ احمد آباد کی طرف جانے والی مرکزی ہائی وے پر نصب سنگ ہائے میل (MILESTONES) پر سے احمد آباد کو مٹا کر ایمد اواد (AMDAVAD) لکھ دیا گیا تھا۔

گجرات ہندوتوا کی لیبارٹری کس طرح بنا؟ ایسا راتوں رات نہیں ہوا۔ سنگھ اور اس کے ہمدردوں نے آزادی کے فوری بعد گجرات میں زہر پھیلانا شروع کر دیا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ کانگرس نے بھی انتخابی مفادات کے لیے احمقانہ انداز میں آر ایس ایس کی مدد کرتے ہوئے گجراتی معاشرے کو تقسیم کرنے والی تباہ کن فضا سے فائدہ اٹھایا۔ 1969ء میں احمد آباد میں ہونے والے فسادات گجرات میں آر ایس ایس کی پہلی کامیابی تھے۔ اس کے بعد اس کی قسمت چمکنا شروع ہو گئی۔

میں 1970ء میں احمد آباد گیا، فسادات کے پانچ ماہ بعد۔ میں نے وہاں سے واپس آ کر جو مضمون لکھا تھا، اس سے ایک اقتباس درج کرتا ہوں:

''میں نے خود پر مشتمل ایک یک شخصی کمیشن بنایا اور تین دنوں میں جو کچھ جان سکتا تھا جانا اور میں اپنا فیصلہ اپنے قارئین کے سامنے پیش کر

رہا ہوں۔

میرا مقصد یہ دریافت کرنا نہیں تھا کہ کیا ہوا ہے۔۔۔ بلکہ یہ کہ کیوں ہوا ہے؟ اور یہ کہ آج احمد آباد کے لوگ کیا سوچتے ہیں اور اگر آئندہ کوئی ایسا واقعہ دوبارہ ہوا، جس نے شہر کی نوے فیصد ہندو اور دس فیصد مسلمان آبادی کے تعلقات کشیدہ کردیے تو وہ کیا کریں گے؟

میں اپنی تفتیش کا آغاز جگن ناتھ مندر کے دورے سے کرتا ہوں۔۔۔ مجھے توڑ پھوڑ کا کوئی سراغ نہیں ملا۔

تسلی کرنے کے لیے میں نے ایک پروہت سے پوچھا۔ اس نے مجھے باہر دیکھنے کا کہا۔ میں باہر گیا اور دیکھا۔ داخلی دروازے کے اوپر کسی مہنت کی شبیہہ کو ڈھانپنے والا شیشہ تھا۔ وہ شیشہ تین جگہ سے تڑخا ہوا تھا۔ میں برگد کے درخت تلے انگ بھبھوت رمائے منتر جاپتے سادھوؤں کے پاس پہنچا اور ان سے پوچھا کہ کیا کوئی نقصان ہوا ہے۔۔۔ انہوں نے ناپاک زبان میں اپنا آپ ظاہر کیا۔

میں بازار سے گزرتا ہوا اس درگاہ پر پہنچا۔ کہا جاتا ہے کہ فساد یہیں سے شروع ہوا تھا۔۔۔ مندر کی گایوں کے ریوڑ نے عرس کے لیے جانے والے زائرین میں بھگدڑ مچا دی تھی۔ درگاہ کا دروازہ بند تھا۔ اس پر کانسٹیبل پہرا دے رہے تھے۔ میں نے باہر بیٹھے ہوئے نگران سے پوچھا کہ کیا یہی وہ جگہ ہے؟ اس نے مشتبہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ جواب دینے کے لیے اس نے بلغم فٹ پاتھ پر تھوکی۔ پولیس سب انسپکٹر نے مجھے گندی نظروں سے دیکھا۔ میں پولیس والوں کو پسند نہیں کرتا پس میں وہاں سے کھسک لیا۔

میں سندھی بازار چلا گیا۔ اس میں بہت سی چھوٹی چھوٹی دکانیں ہیں،

جو پلائی ووڈ (PLYWOOD) اور ٹین کی چادروں سے بنائی گئی ہیں۔ قطار اندر قطار چھوٹی چھوٹی دکانوں میں کپڑے کی گانٹھیں پڑی تھیں اور رنگ رنگ کی ساڑھیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ وہ جگہ انڈین آئل کے پٹرول بردار کی طرح آگ پکڑنے والی دکھائی دیتی ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ اس بازار کو نذر آتش کر دیا گیا تھا۔

میں اس بات پر یقین کر سکتا تھا۔ تاہم مجھے نقصان کا کوئی نشان بھی نظر نہیں آیا۔ سندھی باہمت اور مہم جو نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے ضرور اس کو دوبارہ تعمیر کر کے کاروبار دوبارہ شروع کر دیا ہوگا۔ میں نے اپنے اوپر ہلہ بول دینے والے دکانداروں میں سے ایک کی دعوت قبول کر لی کہ کچھ خریداری کیجئے ۔۔۔ مجھے معلومات کے لئے دھوتی خریدنا پڑی۔ مجھے نفرت سننا پڑی۔

میں نے ایک سکوٹر کرائے پر لیا۔ میٹر پر روغن سے لکھے ہوئے 786 کے عربی اعداد سے مجھے پتا چل گیا کہ ڈرائیور کا عقیدہ کیا ہے۔ دوستانہ مکالمے کے لئے سکوٹر بہترین ذریعۂ سفر نہیں ہے۔ میں نے چلاّ کر ''برے دنوں'' پر تبصرہ کیا۔ ڈرائیور پیچھے مڑا: ''تم مجھے کریدنا چاہتے ہو؟ میں جانتا ہوں تم کس کے ساتھ ہو!'' اس نے زبان سے تو یہ لفظ ادا نہیں کئے تھے تاہم اس کی غمناک آنکھیں یہی کہہ رہی تھیں۔ میں نے پان والوں، چنے والوں، پھل فروشوں سے پوچھنے کی کوشش کی۔ نتیجہ وہی ہے۔ اگر وہ بولیں تو جان لو کہ وہ ہندو ہیں۔ اگر وہ چپ رہیں تو سمجھ لو کہ وہ مسلمان ہیں۔ گفتگو اور خاموشی نفرت سے معمور ہیں۔۔۔

میں خود کو اپنا مشن یاد دلاتا ہوں۔ یہ مردہ ماضی کو کریدنا نہیں ہے بلکہ

جاری مزاج کا اندازہ لگانا اور یوں مستقبل کی پیشگوئی کرنا ہے۔تاہم
ستمبر کے گزرتے ہوئے کل ہمیشہ میرے ساتھ رہتے ہیں۔ میں صابر
متی کے ساتھ ساتھ احمد آباد سے باہر آتا ہوں۔ میں ملبے کے ایک
ڈھیر کے پاس سے گزرتا ہوں۔ایک آدھا ٹوٹا ہوا مینار اس ملبے کی
حقیقت بتادیتا ہے۔
میں قبروں کے پاس سے گزرتا ہوں جن کے کتبے ٹوٹے ہوئے
ہیں۔ میں ضبط کھو بیٹھا ہوں اور آنسو میری آنکھوں سے بہنے لگتے
ہیں۔ وہ کیسے عفریت اور سؤر تھے جنہوں نے نہ تو عبادت گاہوں کو
چھوڑا اور نہ قبروں کو؟''

میں نے اپنے دورے کے اختتام پر احمد آباد کے اس وقت کے میئر کو بتایا کہ میں نے کیا دیکھا ہے اور کیا سنا ہے۔اس نے مجھے تسلی دی: ''جو ہونا تھا ہو چکا ہے۔آئندہ کبھی ایسا نہیں ہوگا۔'' مجھے امید تھی کہ وہ درست کہہ رہا ہے۔تاہم مجھے پورا یقین نہیں تھا۔

بلاشبہ دوبارہ ضرور ایسا ہوا، ایک سے زیادہ مرتبہ اور فروری 2002ء میں تو انتہائی المناک انداز میں۔ میں نے تیس سال سے زیادہ مدت پہلے جن تفریقوں کو دیکھا تھا انہیں ختم نہیں ہونے دیا گیا۔سنگھ والے لوگوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔

گجرات میں، جو کہ ایک سرحدی ریاست ہے، انہوں نے ریاست کی دس فیصد مسلمان آبادی کو دہشت گردی کا نشانہ بنایا ہے اور بیگانہ بنادیا ہے۔وہ جس نقصان کا باعث بنے ہیں، تاریخ اس کا فیصلہ کرے گی، تاہم یہ تو مستقبل میں ہوگا۔اس دوران وہ فاتح مودی جیسے اپنے گروؤں کی پیروی میں گجرات والا تجربہ پورے ہندوستان میں دہرائیں گے، تاوقتیکہ ہم انہیں نہیں روکتے۔

☆☆☆

سنگھ اور اُس کے راکھشس

"اگر ہندوستان کو ایک قوم کے طور پر باقی رہنا ہے اور ترقی کرنی ہے تو اسے لازماً ایک ملک رہنا ہوگا، اپنے سیکولر تشخص کو دوبارہ اپنانا ہوگا اور فرقہ واریت کی بنیاد پر قائم پارٹیوں کو سیاسی میدان سے نکال دینا ہوگا۔۔۔اگر بنیاد پرستوں کا کوئی مذہب ہے تو وہ ہے نفرت"۔

سَنگھ اور اُس کے راکھشس

تمام مذاہب میں ایسے متعصب لوگ ہوتے ہیں اور ہوتے رہیں گے جو کہ ان مذاہب کے بانیوں اور ان کی تعلیمات کی رسوائی کا باعث بنتے ہیں۔ عیسائیوں میں مذہبی محتسب تھے، جنہوں نے بے گناہ مردوں اور عورتوں کو کافر قرار دے کر زندہ جلوا دیا۔ مسلمانوں میں ایسی اسلامی برادریاں ہیں جن کے لیڈر لوگوں کے قتل کے فتوے صادر کرتے ہیں۔ سکھوں میں بھنڈرانوالہ جیسے لوگ تھے، جو مردوں کو اپنی ڈاڑھیاں رنگنے سے اور عورتوں کو ساڑھیاں اور جینز پہننے سے اور ماتھوں پر بندی لگانے سے منع کرتے تھے، جو دھوتی ٹوپی والوں یعنی ہندوؤں کے بارے میں غلط باتیں کرتے تھے۔ ہندو بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ ان کے بھی اپنے جنونی ہیں جو عیسائیت اور اسلام کو پردیسی مذہب قرار دے کر ان کی مذمت کرتے ہیں اور جہاں کرۂ ارض کے سب سے زیادہ روادار دھرم کے پیروکار ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، وہاں عیسائی مشنریوں کو ہراساں اور مسلمانوں کی عبادت گاہوں کو تباہ و برباد کرتے ہیں۔ شری رام کے نام پر انہوں نے ایودھیا میں بابری مسجد کو شہید کر دیا جبکہ گجرات نے مذہبی انتہاپسندی کے بدترین چہرے کی عکاسی کی ہے۔

بابری مسجد کی شہادت، گراہم سٹینز اور اس کے بچوں کے جلائے جانے اور گجرات میں وحشیانہ قتل عام جیسے واقعات مذہب اور سیاست کے متعفن امتزاج کا نتیجہ ہیں۔ میں ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ مذہب اور سیاست ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔ انہیں ہر قیمت پر الگ الگ رکھنا ہو گا۔ تاہم ہندوستانی سیاست کی ہندوائزیشن (HINDUIZATION)

ہندوشاونسٹ پارٹیوں کی افراط اور مرکزی سٹیج پر بی جے پی کا پہنچ جانا، یہ سب عوامل ایک خطرناک حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں: مذہب کے گرد گھومنے والی سیاست یہاں موجود رہے گی اور اس کے شر میری تمہاری سوچ سے بھی زیادہ نقصان پہنچائیں گے۔

ہندو قوم پرستی نے 1886ء میں بنگالی نشاۃ ثانیہ کے دوران ہندو میلوں میں جنم لیا تھا۔ ان میلوں کا اولین مقصد ہندو نوجوانوں کو عسکری فنون، لٹھ بازی، خنجر چلانے اور شمشیر زنی کی تربیت دینا تھا۔ جو لوگ ہندو نہیں ہوتے تھے، انہیں شرکت کی اجازت نہیں تھی۔ وہاں سوامی دیانند سرسوتی کی آریا سماج تحریک بھی تھی، جو شُدھی پر زور دیتی تھی۔ شدھی دیانند کا مقصد تھا، جس کے تحت وہ ہندومت کے سنہری دور کو واپس لانا چاہتا تھا۔ اس نے مسلمانوں اور عیسائیوں کو دوبارہ ہندو بنانے کی مہم چلائی۔ مہاراشٹر میں بال گنگا دھر تلک نے گن پتی اور شیوجی تہواروں کو بحال کیا۔ جب بھی یہ تہوار منائے جاتے ہندو مسلم فسادات چھڑ جاتے۔ اسی زمانے میں بنگال میں انوسلان سمیتیاں (انتظامی تنظیمیں) تھیں، جو ریاست کی تقسیم کو روکنا چاہتی تھیں۔ ان سمیتیوں میں غیر ہندوؤں (NON-HINDUS) کو رکن نہیں بنایا جاتا تھا۔ ہندو سبھائیں، جو شروع میں گئو رکھشا (COW PROTECTION)، ہندی کے قومی زبان کے طور پر فروغ اور حکومت خود اختیاری کے لیے بنی تھیں، باقاعدہ طور پر 1922ء میں ''ہندو مہا سبھا'' میں ڈھل گئیں۔ تاہم 1936ء میں وی۔ ڈی۔ ساورکر کے ''ہندو مہا سبھا'' کے صدر بن جانے کے بعد ہی ایسا ہوا کہ اس تنظیم نے ایک ممتاز ہندو نظریہ، ایک ہندو قوم کا نظریہ اپنایا۔ اس نظریئے کی بنیاد ساورکر کی کتاب ''ہندوتوا'' تھی، جو 1923ء میں شائع ہوئی۔

ساورکر کا کہنا تھا کہ ہندو وہ شخص ہے جو ہندوستان کو اپنی پتر و بھومی (FATHERLAND) اور پنیا بھومی (HOLYLAND) تسلیم کرتا ہے۔ آیا وہ مرد یا عورت سناتن دھرم سے تعلق رکھتی ہے، یہ امر غیر اہم ہے۔ ہر شخص جو ہندو ہے یا جس کے آباؤ اجداد غیر منقسم ہندوستان میں ہندو تھے اور وہ لوگ جو ہندو سے مسلمان یا عیسائی ہو گئے

تھے اگر وہ ہندوستان کو اپنی پتر و بھومی اور پنیا بھومی تسلیم کر لیں تو انہیں واپس ہندو مت میں قبول کر لیا جائے گا۔ تاہم بھارت ماتا کی محبت ہندو ذات پات کے نظام میں کافی نہیں۔ ایک ہندو کو ہندو سنسکرتی سے مجموعی طور پر محبت کرنا اور اس کو قبول کرنا ہوتا ہے۔ اس طرح مسلمان اور عیسائی خود کار انداز میں خارج ہو جاتے ہیں، کیونکہ جہاں ان کی اور ہندوؤں کی پتر و بھومی ایک ہی ہے، وہاں ان کی پنیا بھومی کہیں اور ہے۔ ہندوتوا میں سنسکرت اور دوسری ہندوستانی زبانوں کو پوری طرح تسلیم کیا جاتا ہے مگر اردو یا انگریزی کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ جہاں بدھوں، جینوں اور سکھوں کو قبول کر لیا جاتا ہے کہ ان کے مذاہب کی بنیاد ہندوستان میں ہی رکھی گئی تھی، وہاں مسلمانوں، عیسائیوں اور پارسیوں کو خارج کر دیا جاتا ہے کہ وہ ''اعدادی اقلیتیں'' ہیں۔

ساور کر پہلا شخص ہے، جس نے دو قوموں کا نظریہ پیش کیا تھا، جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو الگ الگ قومیں قرار دیا گیا تھا۔ دو قوموں کے اس نظریے کو تسلیم کرنے والے دوسرے ہندو لیڈروں میں ہندو مہاسبھا کا ڈاکٹر مونجی، بنارس ہندو یونیورسٹی کا بانی پنڈت مدن موہن مالویہ، لالہ لاجپت رائے، بھائی پرم آنند اور سوامی شردھا آنند شامل تھے۔ ممتاز بنگالی ادیب بنکم چندر چٹوپادھیائے نے بھی اس نظریے کی حمایت کی۔

ہندو علیحدگی پسندی کی ندی پاتال گنگا کے مانند برطانیہ کے مغلیہ خاندان کی حکومت ختم اور پورے ہندوستان پر اپنی حکومت قائم کرتے ہی بہنا شروع ہو گئی تھی۔ اس نے ہندوستان میں مسلمانوں کے حقیقی اور تخیلاتی ''غلط کاموں'' کی یادوں کو تازہ کرنے اور بڑھا چڑھا کر پیش کرنے سے تیزی پکڑی۔ ان ''غلط کاموں'' میں شامل تھا: ہندو راجاؤں کی میدانِ جنگ میں تذلیل، ہندوؤں کے مندروں کی بربادی، غیر مسلموں پر جزیہ کا نفاذ اور انہیں دوسرے درجے کے شہری سمجھنا۔ مسلمان حکمرانوں کی مزاحمت کرنے والے پرتھوی راج چوہان، گرو گوبند سنگھ اور شیوا جی جیسے ہندو اور سکھ جنگجوؤں کو قومی ہیروؤں کے طور پر پیش کیا گیا۔

ایک عمومی احساس ابھارا گیا کہ ماضی میں مسلمان فاتحین نے جو غلط کام کئے تھے،

انہیں درست کیا جائے۔ ہندوستانی تحریک آزادی برطانویوں کے علاوہ مسلمانوں کے خلاف بھی تعصب رکھتی تھی۔ جس وقت برطانیہ نے ہندوستان چھوڑنے کا فیصلہ کیا، اسی وقت ہندوؤں کی ایک اچھی خاصی تعداد محسوس کرتی تھی کہ انہیں اپنے آباؤاجداد کے ورثے کا مالک ہونا چاہیے جبکہ مسلمانوں کی اکثریت محسوس کرتی تھی کہ ہندو اکثریت والے ملک میں ان کا کوئی مستقبل نہیں ہوگا۔ اس کے بعد ملک کی ہندوستان اور پاکستان میں تقسیم ناگزیر تھی۔ ہندوستان خود کو ایک ہندو ریاست قرار دے سکتا تھا کیونکہ اس کی اسی فیصد سے زیادہ آبادی ہندو تھی اور اس کے تمام ہمسایہ ملکوں نے خود کو مذہبی ریاستیں قرار دے لیا تھا: اسلامی (پاکستان) بدھ (سری لنکا اور برما) اور ہندو (نیپال)۔ تاہم گاندھی، نہرو، آزاد اور دوسرے رہنماؤں کے زیر اثر فیصلہ کیا گیا کہ ہندوستان ایک جدید سیکولر ریاست ہوگا، جہاں تمام مذاہب کو برابر کے حقوق حاصل ہوں گے۔

یہ تصور زیادہ عرصہ برقرار نہیں رہا۔ نہرو کے دور میں ثانوی اہمیت کی حامل پارٹیوں یعنی آر ایس ایس، ہندو مہا سبھا، جن سنگھ، شیوسینا اور بجرنگ دل نے قوت مجتمع کر لی اور سیکولر طاقتوں کی بڑی دشمن بن گئیں۔ ساورکر کے ہندوتوا کے تصور سے فیضان پا کر، جسے وہ اپنے عقیدے کا ایک جزو تصور کرتے تھے، انہوں نے تاریخ کو جھٹلایا، مسجدوں کو شہید کیا، گرجا گھروں کو جلایا اور مشنریوں پر حملے کئے اور انہوں نے منظم قتل و غارت کی۔ وہ موجودہ حکمرانوں کی پیدل فوج ہیں۔ تاہم اگر ہندوستان کو ایک قوم کے طور پر باقی رہنا ہے اور ترقی کرنی ہے تو اسے لازماً ایک ملک رہنا ہوگا، اپنے سیکولر تشخص کو دوبارہ اپنانا ہوگا اور فرقہ واریت کی بنیاد پر قائم پارٹیوں کو سیاسی میدان سے نکال دینا ہوگا۔

جو ملک اپنی مذہبی رواداری کی روایت پر فخر کرتا ہے اور دُنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے، اُسے ان طاقتوں سے نبرد آزما ہونا پڑے گا، جو ہمارے ماضی اور حال کے لئے خطرہ ہیں نیز جنہوں نے ہمارے مستقبل کے خوابوں کو برباد کر دیا ہے۔ ان طاقتوں کو بآسانی پہچانا جا سکتا ہے۔ یہ سنگھ پریوار کے جنونی حاشیہ بردار ہیں۔۔۔ شیوسینا، وی ایچ پی،

بجرنگ دل اور خودکش دستوں کو جنم دینے والی نئی تنظیمیں۔ کسی بھی باوقار ریاست کو اپنی سرزمین پر نجی فوجوں کو عمل نہیں کرنے دینا چاہیے۔

سابق رکن پارلیمنٹ اور ''بی جے پی ٹوڈے'' کا سابق مدیر پرفل گورادیا آر ایس ایس کے رہنماؤں (ہیجوار اور گول واکر سے لے کر آج تک کے رہنماؤں)، شیوسینا کے بال ٹھاکرے، وی ایچ پی، بجرنگ دل اور سنگھ پریوار کے دوسری پارٹیوں (بشمول بی جے پی) کے رہنماؤں کی طرح ساورکر کی ہندوتوا میں یقین رکھتا ہے۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ وہ نہرو، گاندھی خاندان کا سرگرم مداح تھا اور راجیو گاندھی کے دورِ حکومت میں کانگرس کی ٹکٹ کا امیدوار بھی تھا۔ اسی گورادیا نے ایک کتابچہ لکھا ہے Thus Spoke Indira Gandhi۔ ماضی میں وہ جو کچھ تھا، اب وہ ہندوتوا کا نیا ماننے والا ہے، بی جے پی کے تھنک ٹینک کا رکن ہے اور اس نے ہندوتوا میں اپنے جذباتی یقین کا اظہار The Saffron Book شائع کروا کر کیا ہے۔

ہندوتوا کے دوسرے حامیوں کی طرح گورادیا بھی محمود غزنوی سے لے کر اورنگ زیب تک مسلمان حکمرانوں کے مظالم کی جھوٹی سچی کہانیاں سنا کر ہندوؤں کی موجودہ نسل میں مسلم دشمنی کو راسخ کر رہا ہے۔ وہ تسلیم کرتا ہے کہ ایسا کرنے سے ہندوؤں کا خون غصے سے کھولنے لگتا ہے۔ ہم کتنا عرصہ اپنے خون کو کھولنے دے سکتے ہیں اور قوم کی صحت پر اس کے کیا اثرات ہوں گے؟ گورادیا تسلیم کرتا ہے کہ دورِ حاضر کے مسلمانوں سے صدیوں پہلے ان کے آباؤ اجداد کے اعمال کی بنا پر مسلسل نفرت کرتے رہنے سے الٹ نتائج پیدا ہوں گے۔ تاہم اس کا حل سادہ اور یقین سے ماورا ہے۔ وہ لکھتا ہے: ایک سیدھا سا طریقہ یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمان رہنماؤں کی ایک کانگرس بلائی جائے۔ انہیں اس کتاب میں بیان کردہ سات بے حرمتیوں کا ازالہ کرتے ہوئے ان مقامات کو اٹھا لے جانا چاہیے کیونکہ اس طرح غلط کاریوں کا کوئی شبہ باقی نہیں رہے گا۔''

گورادیا لازماً جانتا ہوگا کہ مسلمان رہنما ان مسجدوں کو ہندوؤں کے حوالے نہیں کر

سکتے جن میں صدیوں سے نمازیں ادا کی جا رہی تھیں۔ بلاشبہ سنگھ پریوار کے ہندوستانی سیاست میں عروج پا جانے سے پہلے کبھی اس قسم کے مطالبے نہیں کیے گئے تھے۔ گورادیا صرف یہی نہیں کہتا کہ ہندوستانی مسلمان ماضی کی خطاؤں پر معافی مانگیں بلکہ وہ ہندوستان میں عیسائیوں کی موجودگی پر بھی ایسے ہی تحفظات رکھتا ہے، وہ نہرو کے سیکولرازم اور سوشلزم اور بہت سی چیزوں کے بارے میں تحفظات رکھتا ہے۔ اس کی کتاب پڑھے جانے کے قابل ہے کیونکہ یہ ہمیں ہندو بنیاد پرستوں کی ذہنیت اور سوچوں سے آشنا کرواتی ہے۔

جب پراوین ٹوگاڈیا اور گری راج کشور سہ شخصی الیکشن کمیشن پر (جس کے دو رکن ہندو ہیں) تنقید کرتے ہیں تو ان کا اشارہ جے۔ ایم۔ لنگڈو کی جانب ہوتا ہے کیونکہ وہ عیسائی ہے اور وہ اسے ''ہندو دشمن'' قرار دیتے ہیں۔ میں ان لوگوں کو چلا کر بتانا چاہتا ہوں کہ: ''لنگڈو ہندو دشمن نہیں ہے۔ وہ ایک مہذب جنٹلمین ہے، فرقہ وارانہ تعصبات سے بالاتر ہے۔ یہ تو تمہارے جیسے لوگ ہیں جو ہندو دشمن ہیں کیونکہ تم نے ہندومت کو رسوا کر دیا ہے۔''

اگر بنیاد پرستوں کا کوئی مذہب ہے تو وہ ہے نفرت۔ وہ دلیل اور منطق کی بجائے جھوٹ اور گالی سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ ان کی نجی فوجیں سیاسی ایجنڈے کے بزورِ قوت نفاذ اور فرقہ ورانہ فسادات میں استعمال کے لیے تیار کی گئی ہیں۔ لا اینڈ آرڈر قائم کرنا سادھوؤں اور مسلح ٹھگوں کا نہیں بلکہ عدلیہ اور پولیس کا کام ہے۔ تاہم یہ واضح طور پر بی جے پی کا اچھی حکمرانی (گڈ گورنینس) کا نظریہ نہیں ہے۔

چند سال پہلے تک میں سوچتا تھا کہ میں اپنے ملک کو اجاڑنے والے فاشزم کی بلا کو اپنے بیمار ذہن کے وہم کے طور پر نظر انداز کر سکتا ہوں۔ لیکن اب میں مزید ایسا نہیں کر سکتا۔ ہندوستانی برانڈ والا فاشزم ہمارے دروازے پر پہنچ گیا ہے۔ ہندوستانی فاشزم کا مہا ڈھونڈورچی نائب وزیراعظم ایل۔ کے۔ ایڈوانی ہے، جو ایمرجنسی کے دوران جیل میں ایڈولف ہٹلر کی MEIN KAMPF پڑھا کرتا تھا۔ بھارتیہ فاشزم پر عمل کرنے والا بدترین شخص بال ٹھاکرے ہے، جو شیوسینا کا سربراہ ہے اور جو کھلم کھلا ہٹلر کو سپرمین قرار دے کر اس

کی تعریفیں کرتا ہے۔ اس کا جلادِ اعظم ہے نریندر مودی، وزیر اعلیٰ گجرات اور بلاشبہ دو ٹکے کے سنگھل، گری راج، کشور، ٹوگاڈیا اور دوسرے مجمعے باز ہیں۔

جرمن ایک پڑھی لکھی قوم ہے لیکن اس کے باوجود وہ انتہائی غیر منطقی قسم کے نسلی تعصب کا شکار ہو گئے تھے۔ ہم تو بہت زیادہ جاہل ہیں اور ہمارے عوام کی پست ترین جبلتوں کو انگیخت کر کے ان پر اپنی مرضی بآسانی چلائی جاسکتی ہے۔ حقائق کو مسخ کرو، اپنی نسل اور مذہب پر فخر کرو، دوسروں کی نسل اور مذہب کے خلاف تعصب برتو اور ان کی مذمت کے ٹیکے لگاؤ اور تمہیں نفرت کا ایک جادوئی گھان ہاتھ آ جائے گا جسے آسانی سے کھولا یا جاسکتا ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ کس طرح بھنڈرانوالہ نے نفرت کا پرچار کر کے سکھ عوام پر غلبہ پالیا تھا۔ آج ہم قومی سطح پر نفرت کے ویسے ہی پرچار کے عینی شاہد ہیں۔ نازیوں کا نشانہ یہودی اور جپسی تھے۔ ہمارے فاشسٹوں کا نشانہ ہماری مذہبی اقلیتیں ہیں۔ اس بات کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ بی جے پی کے سربراہ ونکایاہ نائیڈو نے مسلمانوں کے خلاف مودی کی نفرت بھری تقریروں اور اس کے ساتھیوں کے مسلمانوں پر ظلم وستم کا پرجوش دفاع کیا۔ نائیڈو نے کہا کہ مودی پر مسلمانوں کے قتل عام کا الزام لگانا درست نہیں ہے جبکہ خود اس کے ہاتھ 1984ء میں بہائے جانے والے معصوم سکھوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ واضح بات ہے کہ ان دونوں کے نزدیک اقلیتوں کی وہی حیثیت ہے جو نازیوں کے لئے ہوا کرتی تھی۔

بی جے پی اور اس جیسی دوسری ہندو انتہا پسند تنظیمیں عہد وسطیٰ کے ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے ہندو مخالف اعمال کا ڈھنڈورا پیٹ کر ہندو اکثریت کو اشتعال دلاتی ہیں۔ لیکن ہماری تو پوری تاریخ ہی اس صداقت کی آئینہ دار ہے کہ لوگ نسل اور مذہب کے نام پر تقسیم تھے اور ہر طبقہ تشدد اور تہذیب سوزی کے ذریعے دوسرے پر غالب آنے کی کوشش کرتا تھا۔ کوئی گروہ دوسرے پر الزام نہیں لگا سکتا۔ اگر مسلمانوں نے قتل و غارت کی اور تباہی و بربادی پھیلائی تھی تو غیر مسلموں (راجپوتوں، جاٹوں، مرہٹوں اور سکھوں) نے

بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ہماری تاریخ صرف ہندو مسلم جھگڑوں کی ہی تاریخ نہیں ہے۔ اگر سب نہیں تو بیشتر جھگڑوں میں ہندو مسلمانوں کی طرف اور مسلمان ہندوؤں کی طرف ہوا کرتے تھے۔ گزشتہ تمام صدیوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے باہمی احترام ومحبت کے ساتھ مختلف تنظیمیں قائم کیں اور چلائیں، اس عمل نے ہمارے لئے ایک مشترکہ کلچر کو تخلیق کرنا ممکن بنایا۔ اگرچہ قطب مینار، تاج محل اور فتح پور سیکری نظری اعتبار سے بنیادی طور پر اسلامی ہیں (آپ مغربی ایشیا کی سینکڑوں مسجدوں اور مزارات میں ان کی مشابہت پا سکتے ہیں) تاہم انہیں اکثر و بیشتر ہندو فنکاروں اور ہنر مندوں نے بنایا تھا لہٰذا یہ ہندو مسلم امتزاج ہے جسے ہم بجا طور پر ہندوستانی کہہ سکتے ہیں۔ شاونیتی تکبر اور تعصب سے کام لینا تاریخی حوالے سے غلط اور اخلاقی اعتبار سے نامنصفانہ ہے۔ اگر ہم مسخ حقیقت، فسانے اور مغالطہ آمیز دلائل کے اس زہریلے آمیزے سے نوجوان نسل کا برین واش (BRAINWASH) کریں گے تو ہم ہمیشہ فرقہ واریت کے حقیقی محرک رہیں گے۔ اگر ہم خود کو ایک قوم بنائے رکھنے میں ناکام رہے تو ہم خود اس ناکامی کے ذمہ دار ہوں گے۔ اور ہم خود ہندوستان کی موت کے حقیقی مجرم ہوں گے۔

☆☆☆

نفرت فروش اینڈ کو پرائیویٹ لمیٹڈ

''آر ایس ایس سفاکانہ انداز میں مسلمانوں اور عیسائیوں کی دشمن ہے۔ ہم افغانستان کے عوام کی سماجی اور ثقافتی زندگیوں کو مذہبی گھٹن کا نشانہ بنانے پر طالبان کی مذمت کرتے ہیں، حالانکہ یہی کچھ ہمارے اپنے ملک میں ہو رہا ہے۔ ۔۔۔کوئی محفوظ نہیں ہے''۔

نفرت فروش اینڈ کو پرائیویٹ لمیٹڈ

ہماری دہلیز پر جو درندہ غرا رہا ہے اس کی پہچان کس کو ہے؟

جس خطرے سے ہم دوچار ہیں اس کے حقیقی ادراک کے لئے ضروری ہے کہ ہم آر ایس ایس اور اس کے نظریئے کا ایک تجزیہ کریں۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں ایسا کروں، میں تیس سال پہلے اس وقت کے آر ایس ایس کے سربراہ مادھوراؤ سادیشوراؤ گول واکر سے ہونے والی اپنی ملاقات کا احوال درج کرتا ہوں۔ اس بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے ادراک ہوتا ہے کہ سنگھ پریوار کی کامیابی کافی حد تک اس کے بہت سے رہنماؤں کے سحر اور کرشمے کا نتیجہ ہے۔ وہ لوگ شائستہ، خوش اطوار اور ذہین تھے جنہوں نے اپنا فاشسٹ نظریہ دلکش معقولیت اور منزہ عن الخطا ادب آداب میں چھپا کر عام کیا۔

گرو گول واکر طویل عرصے سے میری فہرست نفرت (HATE LIST) پر سرفہرست چلا آ رہا تھا، کیونکہ میں فسادات میں آر ایس ایس کے کردار، مہاتما کے قتل اور اس کی ہندوستان کو ایک سیکولر ریاست سے ہندو راشٹر میں تبدیل کرنے کی کوشش کو فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے 1939ء کے ایک کتابچے WE, OR OUR NATIONHOOD DEFINED میں ایسے حصے ہیں جن میں نسلی صفائی کے حوالے سے ہٹلر کے نظریئے کو تسلیم کرنے اور جرمنی کو یہودیوں سے پاک کرنے کے اس کے طریقوں کو قبول کیا گیا ہے، میری اس سے ملاقات نومبر 1972ء میں ہوئی۔ میں نے اس سے ''دی السٹریٹڈ ویکلی'' کے لئے انٹرویو کیا تھا:

''مجھے توقع تھی کہ مجھے باوردی سویم سیوکوں کے حلقے سے گزرنا ہوگا۔ تاہم وہاں کوئی وردی پوش موجود نہیں تھا۔ حتیٰ کہ میں کار کا نمبر لکھنے کے لیے سادہ کپڑوں میں سی آئی ڈی کا بندہ بھی نہیں تھا۔ میں اوسط درجے کے ایک اپارٹمنٹ میں داخل ہوا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اندر پوجا کی جارہی ہو۔ باہر قطار میں چپلیں پڑی تھیں، اگر بتی کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی، پردوں کے پیچھے عورتوں کی آوازیں اور برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔ میں نے قدم اندر رکھا۔

وہ ایک چھوٹا سا کمرا ہے جس میں کوئی درجن بھر مرد اور عورتیں بے داغ سفید کرتے دھوتی میں ملبوس بیٹھے ہوئے ہیں۔۔۔ وہ تازہ تازہ نہائے ہوئے لگتے ہیں کہ صرف مہاراشٹر کے برہمن ہی ایسا تاثر دے سکتے ہیں۔ اور وہاں گرو گول واکر موجود ہے۔ وہ عمر کے لحاظ سے ساٹھ کے پیٹے کے وسط میں ہے۔ اس کا جسم نحیف ونزار ہے۔ اس کے سیاہ بال کندھوں تک لمبے ہیں۔ مونچھوں نے اس کا منہ ڈھانپا ہوا ہے، خاکستری ڈاڑھی ٹھوڑی سے لٹکی ہوئی ہے۔ وہ مستقلاً مسکراتا رہتا ہے اور عینک کے شیشوں کے پیچھے اس کی سیاہ آنکھیں چمکتی رہتی ہیں۔ وہ ہندوستانی ہو چی منہ لگتا ہے۔ حال ہی میں اس کے سینے کے کینسر کا علاج ہوا ہے مگر وہ غیر معمولی حد تک ہشاش بشاش لگتا ہے۔ میرا خیال تھا چونکہ وہ گرو ہے اس لئے وہ مجھ سے توقع کرے گا کہ میں چیلوں کی طرح اس کے چرن چھوؤں۔ تاہم میں جیسے اس کے پاؤں چھونے کے لیے جھکا، اس نے میرے ہاتھ اپنی بے گوشت ہڈیوں اور انگلیوں سے پکڑ لئے اور مجھے اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔

وہ ہندی میں کہتا ہے"میں تم سے مل کر بہت خوش ہوا ہوں۔ میں کافی عرصے سے تم سے ملنے کا خواہش مند تھا۔"اس کی ہندی بہت شدھ ہے۔

میں بھونڈے پن سے جواب دیتا ہوں"مجھے بھی آپ سے ملنے کی خواہش تھی۔ اس وقت سے کہ جب سے میں نے آپ کی کتاب BUNCH OF LETTERS پڑھی ہے۔"

وہ میری اصلاح کرتے ہوئے کہتا ہے:

"BUNCH OF THOUGHTS"۔

وہ اس کے بارے میں میرے خیالات جاننا نہیں چاہتا۔

وہ میرا ایک ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیتا ہے اور اسے تھپتھپاتا ہے اور سوالیہ نگاہوں سے میری طرف تکتے ہوئے کہتا ہے:"خوب"۔

"میں نہیں جانتا کہ کہاں سے بات شروع کروں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ شہرت سے نفور ہیں اور آپ کی تنظیم خفیہ ہے۔"

"یہ درست ہے کہ ہم شہرت سے نفرت کرتے ہیں تاہم ہماری تنظیم یا ہم خفیہ نہیں ہیں۔ تم مجھ سے جو چاہو پوچھ سکتے ہو۔"

"میں نے جیک کرن کی کتاب:

THE RSS AND HINDU MILITARISM میں آپ کی تحریک کے بارے میں پڑھا ہے۔ وہ کہتا ہے۔۔۔"

گرو جی بات کاٹتے ہوئے کہتے ہیں:"اس کا بیان متعصبانہ، نامنصفانہ اور نا درست ہے۔۔۔ اس نے میری اور بہت سے دوسرے لوگوں کی باتوں کا حوالہ غلط دیا ہے۔ ہماری تحریک میں عسکریت بالکل نہیں ہے۔ ہاں ہم نظم وضبط کو اہمیت دیتے ہیں۔۔۔

یہ الگ معاملہ ہے۔"

میں اُسے بتاتا ہوں کہ میں نے ایک مضمون میں پڑھا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ کرن یورپ اور افریقہ میں سی آئی اے کا سربراہ ہے۔

میں بڑی سادگی سے کہتا ہوں: "مجھے تو اس پر کبھی ایسا شبہ نہیں ہوا، میں بیس برس سے اُسے جانتا ہوں۔"

گرو جی نے مسکرا کر مجھے دیکھا: "مجھے اس پر حیرت نہیں ہے۔"

میں نہیں جانتا کہ اس نے یہ تبصرہ کرن کے سی آئی اے کا ایجنٹ ہونے کے حوالے سے کیا تھا یا میری سادہ لوحی پر۔

"آر ایس ایس کے حوالے سے ایک چیز مجھے پریشان کرتی ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں صاف صاف سوال کرلوں؟"

"ہاں، ہاں۔۔۔"

"میرا سوال اقلیتوں خصوصاً عیسائیوں اور مسلمانوں کے ساتھ آپ کے طرزِ عمل کے بارے میں ہے۔"

"ہمیں عیسائیوں سے کوئی اختلاف نہیں سوائے ان کے لوگوں کو عیسائی بنانے کے طریقے کے۔ جب وہ بیمار لوگوں کو دوا یا بھوکے لوگوں کو روٹی دیتے ہیں تو انہیں اس صورتِ حال کو ان لوگوں میں اپنے مذہب کے پرچار کے لئے استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ میں تو خوش ہوں کہ ہندوستانی گرجا گھروں کو روم سے آزادی اور خودمختاری دلوانے کے لئے ایک تحریک چل رہی ہے۔"

"مسلمانوں کے بارے میں کچھ کہیئے۔"

"میں ان کے بارے میں کیا کہوں؟

"بلاشبہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کی ہندوستانی اور پاکستان کے

ساتھ دہری وفاداری تاریخی عوامل کی وجہ سے ہے جس کے لئے ہندو بھی اتنے ہی ذمہ دار ہیں جتنے کہ وہ۔ اس کی وجہ عدم تحفظ کا احساس بھی ہے جس سے وہ تقسیم کے وقت سے دوچار ہیں۔ بہرصورت انسان چند لوگوں کی غلطیوں کا ذمہ دار پوری کمیونٹی کو قرار نہیں دے سکتا۔"

"گرو جی! ہمارے ملک میں چھ کروڑ مسلمان موجود ہیں۔ ہم انہیں فنا نہیں کر سکتے، ہم انہیں ہندوستان سے باہر نہیں نکال سکتے، ہم ان کا مذہب تبدیل نہیں کروا سکتے۔ ہمیں لازماً انہیں تسلی دینا ہوگی۔۔۔ انہیں احساس دلانا ہوگا کہ ہم انہیں چاہتے ہیں۔ آیئے! ہم محبت کے ذریعے ان کے دل جیت لیں۔۔۔"

اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا: "حقیقت میں میں بھی یہی کہتا ہوں کہ مسلمانوں کے لیے واحد درست پالیسی یہی ہے کہ انہیں محبت کے ذریعے وفادار بنایا جائے۔"

میں حیران رہ گیا۔ کیا وہ لفاظی تو نہیں کر رہا؟ یا کیا وہ سچ بول رہا ہے؟

اس نے اپنی بات جاری رکھی: "جماعتِ اسلامی کا ایک وفد میرے پاس آیا تھا۔ میں نے انہیں کہا کہ مسلمانوں کو لازماً یہ بھلا دینا ہوگا کہ انہوں نے ہندوستان پر حکومت کی ہے۔ انہیں دوسرے مسلمان ملکوں کو اپنی مادر وطن نہیں سمجھنا چاہیے۔ انہیں لازماً مرکزی دھارے کی ہندوستانیت (INDIANISM) میں ملنا ہوگا۔"

"کس طرح؟" میں نے پوچھا۔

"ہمیں چاہیے کہ انہیں معاملات سمجھائیں۔ بعض اوقات انسان کو مسلمانوں کے کاموں پر غصہ آجاتا ہے تاہم ہندو خون میں ناراضگی

زیادہ دیر نہیں رہتی۔ وقت عظیم معالج ہے۔ میں امید پرست ہوں اور محسوس کرتا ہوں کہ ہندومت اور اسلام ایک دوسرے کے ساتھ جینا سیکھ جائیں گے۔"

اس گفتگو کے بعد چائے پیش کی گئی۔ گروجی کا شیشے کا مگ انفرادیت کا آئینہ دار تھا۔ میں اس سے پوچھتا ہوں کہ وہ ہم سب کی طرح چینی مٹی کے برتنوں میں مشروبات کیوں نہیں لیتا۔ وہ مسکراتا ہے۔

"میں ہمیشہ اس مگ میں چائے پیتا ہوں۔ میں جہاں بھی جاتا ہوں، یہ مگ میرے ساتھ ہوتا ہے۔"

اس کا قریب ترین رفیق ڈاکٹر ٹھاٹے، جس نے اپنی زندگی آر ایس ایس کے لئے وقف کر دی ہوئی ہے، وضاحت کرتا ہے: "چینی مٹی کے برتنوں کا اوپری روغن اُتر جاتا ہے اور اندر سے مٹی نظر آنے لگتی ہے۔ مٹی میں جراثم مل سکتے ہیں۔"

میں اپنے موضوع کی طرف لوٹتا ہوں۔

"آپ کیوں اپنے عقیدے سے جڑے ہوئے ہیں جبکہ بیشتر دنیا غیر مذہبی اور لاادری ہو رہی ہے؟"

"ہندومت کی بنیادیں مضبوط ہیں کیونکہ اس میں ادعائیت نہیں ہے۔ اس میں لاادری پہلے ہی رہ چکے ہیں۔ یہ کسی بھی دوسرے مذہبی نظام سے زیادہ بہتر طور پر لامذہبیت کی لہر سے بچ جائے گا۔"

"آپ ایسا کس طرح کہہ سکتے ہیں؟ شہادت تو اس کے برعکس بتاتی ہے۔ صرف وہی مذہب مضبوط ہیں اور لوگوں پر اپنی گرفت میں اضافہ کر رہے ہیں جن کی بنیاد کٹڑ عقائد پر ہے۔۔۔ کیتھولک ازم اور اس سے زیادہ اسلام۔"

"یہ عبوری مرحلہ ہے۔ لاادریت ہم پر تو غلبہ پالے گی مگر یہ ہندومت پر غلبہ نہیں پا سکے گی۔ ہمارا مذہب لغت کے معنوں والا مذہب نہیں ہے۔ یہ تو دھرم ہے، ایک طرزِ زیست۔ ہندومت لا ادریت پر بآسانی قابو پالے گا۔"

میں گرو جی کا آدھے گھنٹے سے زیادہ وقت لے چکا ہوں۔ وہ بے قراری کا کوئی اشارہ تک نہیں دے رہے ہیں۔ جب میں رخصت ہونے کی اجازت چاہتا ہوں تو وہ دوبارہ میرے ہاتھ پکڑ کر مجھے پاؤں چھونے سے روک دیتے ہیں۔

مجھے یاد آتا ہے کہ میں گرو گول واکر سے متاثر ہوا تھا کیونکہ اس نے مجھے اپنے نقطۂ نظر کا قائل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس نے تو مجھے یہ احساس دیا تھا کہ وہ جبر کا قائل نہیں ہے۔ میں نے ناگپور میں اس سے ملنے اور سب کچھ خود دیکھنے کا اس کا بلاوا قبول کیا تھا۔ میں نے اس وقت سوچا تھا کہ شاید میں اس سے ہندو مسلم اتحاد کو آر ایس ایس کا مرکزی مقصد بنوانے میں کامیاب ہو سکتا ہوں۔ میں ایک سادہ ذہن "سردار" ہی رہا۔ سنگھ پریوار کے تعلقاتِ عامہ کے لوگ اپنے مشن کے حوالے سے حقائق مزید نہیں چھپا سکتے۔ اور سچ تو یہ ہے: راشٹریہ سیوک سنگھ کا مقصد "ہندو کلچر کا فروغ" ہے۔ یہ "کلچر" ایک "نظامِ اقدار" ہے جس کی اساس ساورکر کا ہندوتوا کا تصور ہے اور بلاشبہ یہ ایک ہندو نظامِ اقدار ہے۔ آر ایس ایس کا مشن "دھرم کی مضبوط بنیاد پر ہماری قوم کو متحد کرنا اور دوبارہ عروج پر لانا ہے۔" یہ ایک ایسا مشن ہے جسے "ایک مضبوط اور متحد ہندو معاشرے" کے ذریعے تکمیل تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے ہندوؤں کو متحد کرنے کا بیڑا اٹھایا ہوا ہے۔ کیونکہ اس کا اعتقاد ہے کہ "ہندو قوم کا عروج پوری انسانیت کے مفاد میں ہے۔" واضح طور پر یہاں کسی بھی ایسے شخص کے لئے گنجائش نہیں ہے، جو ہندو دیوتاؤں کی پرستش نہیں کرتا۔

آر ایس ایس سفاکانہ انداز میں مسلمانوں اور عیسائیوں کی دشمن ہے۔ گول واکر نے تو

اس وقت بھی اعتراض کیا تھا جب عبدالحمید اور کیلر برادران کو ہندو پاک جنگ کے دوران بہادری دکھانے پر حکومت نے اعزاز دیا تھا۔۔۔دلیر مرد غیر ہندو (NON-HINDU) جو تھے۔

مہاتما کے قتل کے بعد سے آر ایس ایس، وی ایچ پی، بی جے پی اور بجرنگ دل اور ونواسی کلیان آشرم جیسی آر ایس ایس کی بغل بچہ تنظیموں نے پورے ملک میں ان گنت فرقہ وارانہ فسادات کروائے ہیں۔ آر ایس ایس کی اتحادی شیوسینا، بال ٹھاکرے کی زیرِ قیادت ہندوستان کے لئے ''مہربان آمریت'' میں یقین رکھتی ہے۔ مرحوم راجا سندیا جیسے بی جے پی رہنما ستی جیسی غیر انسانی رسم کے حامی تھے اور ذات پات کے ہندو نظام میں یقین رکھتے تھے۔ ہر سال 14 فروری کو سینٹ ویلنٹائن کے دن شیوسینا کے فوجی (سَینِک) پورے ملک میں دنگا فساد کرتے ہیں۔ وہ بسوں کو جلاتے ہیں، دکانوں کو توڑتے پھوڑتے ہیں اور اپنے بقول ''تہذیبی زوال'' کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے عمومی طور پر اپنے آپ کو رسوا کرتے ہیں۔ وہ ایک ہندو راشٹر کو مغربی رسومات کے بُرے اثرات سے بچانے کے خواہش مند ہیں۔

ہم افغانستان کے عوام کی سماجی اور ثقافتی زندگیوں کو مذہبی گھٹن کا نشانہ بنانے پر طالبان کی مذمت کرتے ہیں۔ حالانکہ یہی کچھ ہمارے اپنے ملک میں ہو رہا ہے اور ہم اپنی روزمرہ زندگی کے ہر شعبے میں اس کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ نہ صرف شیوسینا ''مغربی اثرات'' کے حوالے سے غیض وغضب کا اظہار کرتی ہے بلکہ وزیرِ سیاحت وثقافت بھاونا بن چکالا یا نے حال ہی میں پورے ملک کے ہوٹلوں میں ڈسکو کلبوں پر پابندی لگادی ہے۔ وہ محسوس کرتی تھی کہ یہ کلب ''ہماری ثقافت کے خلاف'' تھے اور ''ہماری بھارتیہ سنسکرتی پر برا اثر'' ڈال رہے تھے۔ چند سال پہلے کی بات ہے سشما سوراج نے ''فیشن ٹیلی ویژن'' کے خلاف شور وغوغا مچا دیا تھا اور سنگھ نے پورے ملک میں دیپا مہتا کی فلم ''فائر'' کے خلاف احتجاج کئے تھے اور حد تو یہ ہے کہ اس کی اگلی فلم ''واٹر'' کو رکوانے میں کامیاب ہو گئے، جو کہ بنارس کی بیواؤں پر بنائی جانی

تھی۔

اس اخلاقی پولیس (MORAL POLICE) کو کتابوں، ڈراموں، موسیقی اور آرٹ سے چڑ ہے۔ ایک ہندو راشٹر بنانے کی جدوجہد میں وہ شاہ بانو کیس بنا چکے ہیں۔ جس میں انہوں نے کانگرس کی مسلمان آرتھوڈوکسی کی تشفی کرنے کو ترپ کے پتے کے طور پر استعمال کیا تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کی ''غلطیوں'' کو درست کرنے کے لیے تاریخ کو دوبارہ لکھوایا ہے۔ انہوں نے نصابی کتابوں سے بائیں بازو کے متن میں ''ترمیم'' کرنے اور اکیسویں صدی کو نام نہاد ہندو سنہرا دور قرار دینے کی کوشش کی ہے۔

ہر فاشسٹ حکومت کو ایسے گروہوں اور کمیونٹیوں کی ضرورت ہوتی ہے جنہیں وہ اپنا آلہء کار بنا سکے۔ ابتداء ایک یا دو گروہوں سے ہوتی ہے۔ تاہم یہ سلسلہ وہیں رک نہیں جاتا۔ جو تحریک نفرت کی بنیاد پر استوار ہوتی ہے اُسے اپنے آپ کو برقرار رکھنے کے لیے مسلسل خوف اور دہشت پیدا کرنی پڑتی ہے۔ جو لوگ اپنے آپ کو اس لئے محفوظ سمجھ رہے ہیں کہ وہ مسلمان یا عیسائی نہیں ہیں، وہ احمقوں کی جنت میں رہتے ہیں۔ سنگھ پہلے ہی بائیں بازو کے تاریخ دانوں اور ''مغرب زدہ'' نوجوانوں کو نشانہ بنا چکا ہے۔ آئندہ ان کی نفرت کا رخ سکرٹ پہننے والی عورتوں، گوشت کھانے والے لوگوں، شراب پینے والوں، غیر ملکی فلمیں دیکھنے والوں، مندروں میں سالانہ پوجا کے لئے نہ جانے والوں، دانت منجن کی بجائے ٹوتھ پیسٹ استعمال کرنے والوں، ویدوں پر ایلو پیتھک ڈاکٹروں کو ترجیح دینے والوں، ''جے شری رام۔۔۔'' کا نعرہ لگانے کے بجائے بوسہ لینے یا مصافحہ کرنے والوں کی طرف بھی ہو سکتا ہے۔ کوئی محفوظ نہیں ہے۔ اگر ہم ہندوستان کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں مذکورہ حقیقت کا لازماً ادراک کرنا ہوگا۔

☆☆☆

فرقہ واریت۔۔۔ایک پرانا مسئلہ

''یہ آکٹوپس سے بھی زیادہ بازوؤں کی مالک ہے۔۔۔ کانگرس نے بالخصوص اندرا گاندھی کی زیر قیادت اپنا غلیظ کردار ادا کیا۔ بی جے پی صرف اپنی ڈھٹائی اور سختی کی وجہ سے خطرناک ہے کیونکہ یہ جمہوریت کو اپنا فاشسٹ ایجنڈا چھپانے کے لیے استعمال کرتی ہے۔۔۔ ہر شخص کے ہاتھ خون آلود ہیں''۔

فرقہ واریت۔۔۔ایک پرانا مسئلہ

''یہ آکٹوپس سے بھی زیادہ بازوؤں کی مالک ہے'' علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اردو کے پروفیسر قاضی عبدالستار گرجے۔ ہم 2002ء کے اواخر میں کانپور میں ہونے والے ایک سیمینار میں موجود تھے۔ اوسٹرم پر دوسرے لوگوں کے علاوہ ادیب راجندر یادیو اور کرشنا سوبتی نیز زعفرانی کپڑوں والا سادھو سیاستدان سوامی اگنی ویش بیٹھے تھے۔ سیمینار کا افتتاح خونریزی سے ہوا تھا۔ مرچنٹ چیمبر ہال کے گرد پولیس بندوبست اس وقت درہم برہم ہو گیا جب ایک سینئر ہیڈ کانسٹیبل نے ایک جونیئر کو فرائض ادا کرنے میں غفلت برتنے پر لعن طعن کی۔ جونیئر نے اس کے سینے پر گولی مار کر جواب دیا۔ اس واقعے کے بعد ہم فرقہ واریت کے مسئلے پر یوں بحث مباحثہ کرنے لگے گویا کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

سامعین صاحب ذوق تھے لہٰذا جب فرقہ واریت کا موازنہ آکٹوپس سے کیا گیا تو واہ واہ! کی صدائیں بلند ہوئیں۔ شیوجی کے بحری بیڑے کا امیر البحر کون تھا؟ قاضی صاحب نے دریافت کیا اور پھر خود ہی سوال کا جواب دیا: ''ایک مسلمان۔'' انہوں نے شیوجی کے سیکولرازم کے جھنڈے کو مزید اُوپر اٹھاتے ہوئے کہا: ''شیوجی کے توپ خانے کا کمان دار کون تھا؟'' ایک مسلمان۔ جب شیوجی نے سورت کو تاخت و تاراج کیا تھا تو وہ قرآن مجید کا ایک نسخہ احترام کے ساتھ اپنے سر پر رکھ کر واپس آیا تھا۔ اس طرح سے قاضی صاحب نے مرہٹہ ہیرو کا پرجوش تذکرہ کیا۔ میں نے تو کسی تاریخ کی کتاب میں ان باتوں کو نہیں پڑھا ہے تاہم اس فضا میں تاریخی حقائق سے زیادہ جذبات اہمیت رکھتے تھے۔

ہم سب نے لمبی لمبی تقریریں کیں اور خوب سراہے گئے۔ ہم نے اپنے مباحثے کا اختتام اس نتیجے پر کیا کہ میرے اور تمہارے علاوہ ساری دنیا فرقہ پرست ہے بلکہ تم بھی اک ذرا فرقہ پرست ہو۔ ہم اگلے روز اپنے اپنے معاملات کی طرف لوٹ گئے اور دنیا میں کچھ بھی تبدیل نہیں ہوا۔

قاضی ستار کا یہ کہنا بجا تھا کہ فرقہ واریت ایک بہت سارے بازوؤں والا آکٹوپس ہے اور جب یہ حملہ کرتی ہے تو بالکل ایک آکٹوپس ہی کی طرح سیاہی پھینکتی ہے جو حملہ آور کا دکھائی دینا مشکل بنا دیتی ہے۔ تفرقہ پسند بے پر کی اڑاتا ہے جس سے حملہ آور الزام سے بچ نکلتا ہے۔ ان جھوٹی باتوں کو اکثر کٹڑ گاندھی پرستوں سے مستعار لیا جاتا ہے، جو کہ اکثر و بیشتر حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ جن عقیدوں کو فرقہ پرست اپنے فائدے کے لیے استعمال کرتے ہیں، ان میں سے ایک ہے: ''ہندو مسلم بھائی بھائی'' کا نظریہ۔ اس نظریئے کے مطابق ہم سب خدائے واحد کی مخلوق ہیں جو ایشور بھی ہے اور اللہ بھی، رام بھی ہے اور رحیم بھی، لہٰذا ہندو اور مسلمان اور عیسائی بھائی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جہاں کہیں بھی مختلف نسلوں، مذاہب، زبانوں اور کلچروں کے لوگ رہے ہیں، وہاں ''بھائی بھائی ازم'' کی بجائے تناؤ ہوتا ہے۔ اور اگر زمین، جائیداد اور کاروبار درمیان میں ہوں تو تناؤ اکثر و بیشتر دھماکہ خیز تشدد میں ڈھل جاتا ہے۔ دوسری بے بنیاد بات یہ ہے کہ برطانیہ کے اپنی ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' (DIVIDE AND RULE) کی پالیسی کو نافذ کرنے سے پہلے فرقہ وارانہ فسادات نہیں ہوتے تھے۔ درحقیقت ہندو مسلم تناؤ اس وقت سے موجود ہے، جب سے اسلام ہندوستان میں آیا ہے۔ اور اسلام سے پہلے ہندوؤں اور جینوں، ہندوؤں اور بدھوں، دراوڑوں اور آریاؤں کے درمیان تصادم رہتا تھا۔

یہ غلط ہے اور اس کے نتائج الٹ پیدا ہوتے ہیں کہ فرقہ واریت کو سنگھ پریوار نے ہندوستان میں جنم دیا ہے۔ سنگھ کا کارنامہ تو یہ ہے کہ اس نے پہلے سے موجود تعصب میں سے ایک عفریت کو تخلیق کیا۔ کانگرس نے، بالخصوص اندرا گاندھی کی زیر قیادت، اپنا غلیظ

کردار ادا کیا۔ بی جے پی صرف اپنی ڈھٹائی اور سختی کی وجہ سے زیادہ خطرناک ہے۔ یہ اس لئے بھی زیادہ خطرناک ہے کیونکہ یہ جمہوریت کو اپنا فاشسٹ ایجنڈا چھپانے کے لیے استعمال کرتی ہے۔ تاہم ہر شخص کے ہاتھ خون آلود ہیں۔ ہندوستان کے ہر مذہبی اور نسلی گروہ کو قتل وخونریزی پر اکسایا جا سکتا ہے اور اکسایا گیا ہے۔ اس کی سب سے زیادہ دہشت ناک مثال 1983ء میں آسام کے شہر نیلائی میں ہونے والا واقعہ ہے۔ وہاں قتل وغارت کے ایک ہی طویل سلسلے کے دوران 3000 مردوں، عورتوں اور بچوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ بنگلہ دیشی پناہ گزینوں نے بنگالیوں اور آسامیوں کو قتل کیا، بنگالیوں اور آسامیوں نے ایک دوسرے کو ہلاک کیا، قبائلیوں نے غیر قبائلیوں کو موت کے گھاٹ اُتارا، مسلمانوں نے ہندوؤں اور عیسائیوں کو تہِ تیغ کیا اور عیسائیوں نے ہندوؤں کو نیست و نابود کر دیا۔ مختصر یہ کہ ہر کوئی ایک دوسرے کو قتل کر رہا تھا۔

یہ یقین کرنا سادہ لوحی ہو گی کہ فرقہ واریت صرف ووٹ کے ذریعے بی جے پی کو اقتدار سے باہر کرنے کے بعد ختم ہو جائے گی۔ مسئلہ اس سے کہیں زیادہ بڑا ہے اور اگرچہ آج یہ بی جے پی کی سیاست کی وجہ سے دہشت ناک حد تک بڑھ گیا ہے تاہم یہ مسئلہ بہت لمبے عرصے سے موجود ہے۔ ہمیں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

☆☆☆

فرقہ واریت کی مختصر تاریخ

یہ دو ہزار سال سے زیادہ عرصہ پہلے کی بات ہے۔ بدھ مت ہندوستان میں عروج پر تھا۔ شہنشاہ اشوک بدھ مت قبول کرنے والا سب سے زیادہ مشہور انسان تھا۔ جب برہمنی ہندومت نے شاہی خاندانوں میں دوبارہ قبولیت حاصل کی، خصوصاً نویں اور دسویں صدی میں، تو بدھوں کا قتلِ عام ہوا اور ان کی عبادت گاہوں کو مسمار کر دیا گیا۔ بعدازاں بہت سے مسلمان حکمرانوں کے دور میں ہندوؤں سے امتیاز برتا گیا۔

برطانیہ "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی پر عمل پیرا تھا۔ تاہم ہندوستان میں لوگوں کو تقسیم کرنا اور لڑانا کبھی مشکل نہیں رہا تھا۔ وقتاً فوقتاً ہندو مسلم فسادات ہوتے رہتے تھے اور برطانیہ کے لیے یہ صورتِ حال اس وقت گوارا تھی کہ جب تک ان کی سلطنت کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوتا۔ عیسائی فطری طور پر برطانوی اقتدار کے دوران اپنے آپ کو زیادہ محفوظ محسوس کرتے تھے۔ تاہم اس دور میں مذہب کے نام پر حکومت نے کوئی داروگیر نہیں کی۔ امتیاز کی بنیاد نسلی تھی۔

آزادی کے ساتھ تقسیم عمل میں آئی اور ہندوستان کی تاریخ کا بدترین فرقہ وارانہ تشدد ہوا۔ میں اس پاگل پن کا عینی شاہد ہوں اور میرا خیال تھا کہ قوم اپنے انجام کے قریب پہنچ گئی ہے۔ میں اگست 1947ء کے پہلے ہفتے میں لاہور میں تھا۔ میں اسی مہینے کے دوسرے نصف حصے میں دہلی میں تھا۔ مجھے نہیں پتا کہ میں کس ملک سے تعلق رکھتا ہوں۔۔۔ ہندوستان سے یا پاکستان سے۔ میں ایک ایسی بستی میں پیدا ہوا تھا جو آج کے پاکستان کے

قلب میں واقع تھی۔ میں اپنی باقی زندگی لاہور میں گزارنا چاہتا تھا۔ مجھے ان مسلمانوں سے ہمدردی تھی جو اپنے لئے ایک الگ ریاست کے خواہش مند تھے اور میں اسی مسلم ریاست میں زندگی بسر کرنے کے لئے اپنے آپ کو آمادہ کر چکا تھا۔ مجھے ایسا کرنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ میرے لاہور چھوڑنے سے ایک ہفتے پہلے میرے دائیں بائیں والے ہمسایوں نے اپنی مذہبی شناخت اپنے گھروں کی دیواروں پر بڑے بڑے الفاظ اور علامات میں عیاں کر دی۔ میری بائیں طرف والی دیوار پر اردو میں لکھا تھا: پارسی کا مکان۔ دوسری دیوار پر بہت بڑی صلیب بنائی گئی تھی، جو اس امر کا اظہار تھا کہ اس گھر کے مکین عیسائی ہیں۔ انہیں یہ تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ نزدیکی علاقے مزنگ کے لوگوں نے ہندوؤں اور سکھوں کے گھروں کو لوٹنے اور ان پر زبردستی قبضہ کرنے کے لئے نشان زد کرنا شروع کر دیا تھا۔ مجھ پر روزِ روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ پاکستان میں میرے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس کی وجہ کوئی اور نہیں صرف یہ تھی کہ میں سکھ تھا۔

نئی سرحد کے مشرق میں کلکتہ میں ہونے والے طویل ہندو مسلم فسادات بہار میں مسلمانوں کے قتل عام کا پیش خیمہ بنے، جس کے جواب میں مشرقی بنگال میں نواکھالی میں ہندوؤں کو مارا گیا۔ ہندوؤں اور سکھوں کے قافلے تحفظ کے لیے سرحد پار جانے لگے۔ بیشتر راستے ہی میں مارے گئے۔

کچھ وقت کے لئے اپنے گھر سے محروم ہونے اور ہزاروں لوگوں کی ہلاکت اور لاکھوں کی بے گھری کا صدمہ نئی نئی حاصل ہونے والی آزادی کی خوشی نے دھیما کر دیا۔ میں 14/15 اگست 1947ء کو آدھی رات کے وقت پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے جمع ہو جانے والے بہت بڑے ہجوم میں شامل تھا۔ کامل سکوت میں ہم نے سچیتا کرپلانی کو وندے ماترم گاتے اور پنڈت نہرو کی تقریر سنی۔ ہم وہاں صبح طلوع ہونے تک موجود رہے۔ ''بھارت ماتا کی جے'' اور ''مہاتما گاندھی کی جے'' جیسے نعرے لگا لگا کر ہمارے گلے بیٹھ گئے۔

جب وہ وقت گزر گیا تو دھیرے دھیرے مجھ پر سچ عیاں ہونے لگا۔ کیا یہی وہ آزادی

ہے، جس کا ہمیں اتنا انتظار تھا؟ فیض احمد فیض کی اگست 1947ء میں لکھی ہوئی نظم مجھے یاد آ رہی ہے:

یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر
کہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل

میں لاکھوں دوسرے پناہ گزینوں کی نسبت زیادہ خوش قسمت تھا کہ لاہور والا گھر کھو دینے کے بعد یہاں میں اپنے باپ کے گھر آ گیا تھا۔ جلد ہی مجھے وزارتِ خارجہ میں نوکری مل گئی۔ تاہم تقسیم کے فسادات کی یادیں مجھے دہشت زدہ کرتی رہیں۔ مجھے امرتا پریتم کا وہ لافانی نوحہ یاد آتا تھا، جس میں اس نے ''ہیر رانجھا'' کے شاعر وارث شاہ کی روح سے مخاطب ہو کر کہا تھا:

اج آکھاں وارث شاہ نوں اٹھ قبراں وچوں بول
اَتے نویں کتاب عشق دا کوئی اگلا ورقا پھول
اک روئی دھی پنجاب دی توں لکھ لکھ مارے وین
اج لکھاں دھیاں روندیاں تینوں وارث شاہ نوں کہن
او درد منداں دیا دردیا اٹھ تک اپنا پنجاب
بیلے لاشاں وِچھیاں لہو دی بھری چناب

آزاد ہندوستان میں حالات معمول پر آنے لگے۔ میرا خیال تھا کہ ہم بدترین حالات دیکھ چکے ہیں اور مجھے امید تھی کہ ہندو مسلم فساد دوبارہ کبھی نہیں ہوں گے۔ برطانیہ نے اپنے اقتدار کے دوام کے لئے برادریوں کو جدا جدا رکھا تھا۔ اب جب کہ وہ چلے گئے ہیں تو ہم مذہبی، لسانی اور ذات پات کی تفریقوں پر حاوی آ کر ایک مشترک ہندوستانی تشخص وضع

کریں گے۔ مجھے امید تھی کہ تقسیم کے وقت بہنے والے بے پناہ خون کے ساتھ ہمارے جسموں میں موجود فرقہ واریت کا زہر بھی نکل گیا ہوگا۔

افسوس! چند سال کی خاموشی کے بعد فرقہ واریت کا وائرس ملک کے مختلف حصوں میں دوبارہ نمودار ہو گیا۔ کمیشن آف انکوائری نے صریح الفاظ میں کہا کہ آزادی کے بعد ہونے والے تمام ہندو مسلم فسادات میں ہونے والا استرفی صد جانی و مالی نقصان مسلمانوں کا ہوا۔ فرقہ وارانہ تشدد پر قابو پانے میں پولیس کی غیر جانبداری پر مجھے تو یقین ہے تاہم مجھے اکثریتی برادری کی طرف سے بہتر کارکردگی کی امید تھی۔ پولیس اپنے فرائض ادا کرنے میں ناکام رہی اور سیاستدانوں نے اس کا فائدہ اٹھایا۔

اندرا گاندھی کے وزیراعظم بننے کے بعد مذہب کا سیاست میں عمل دخل زیادہ ہونے لگا۔ مذہب اور برادری کی بنیاد پر قائم سیاسی پارٹیاں سیاسی فائدے کے لیے لوگوں کے مذہبی اور فرقہ وارانہ جذبات سے کھیلنے لگیں۔ انہیں اپنے وحشیانہ ترین خوابوں سے بھی زیادہ کامیابی حاصل ہوئی۔ ہم ایک ایسے موڑ پر آ چکے ہیں کہ جہاں ہندوستانی سیکولرازم کو "نام نہاد" کہنا مبالغہ آرائی نہیں ہوگی۔ برطانوی حکمرانی کے دوران فرقہ وارانہ تشدد صرف ہولی، عیدالاضحیٰ اور گن پتی تہوار جیسے مواقع پر ہندو مسلم تصادمات تک ہی محدود تھا۔ فسادات صرف چند فساد زدہ شہروں ہی میں ہوتے تھے۔ آج فسادات ہندوؤں اور مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں، ہندوؤں اور عیسائیوں، بڑی ذات کے ہندوؤں اور ہریجنوں، قبائلیوں اور غیر قبائلیوں، بنگالیوں اور آسامیوں، مہاراشٹریوں اور کناڈیگوں میں ہوتے ہیں۔ پورا ملک فسادہ زدہ بن گیا ہے۔ ہر شخص کا ہاتھ اپنے ہمسائے کے گریبان پر ہے کیونکہ وہ اپنے ہمسائے کی ہر شے حاصل کر لینا چاہتا ہے۔۔۔ اس کی زمین، اس کی ملازمت یا اُس کا کاروبار نسلی، مذہبی اور لسانی اختلافات ایسا کرنے کے لیے بہانہ بن جاتے ہیں۔ تعلیم یافتہ درمیانے طبقے کے تاجر (درمیانہ طبقہ ہی بی جے پی کا حلقۂ انتخاب ہے) اور سیاستدان (شاید کمیونسٹوں کے استثنا کے ساتھ) فسادیوں کو تحریک دیتے ہیں۔ ان کا آلۂ کار بنتے ہیں

بے عقل لوگ اور تعلیم یافتہ بے روزگار اور جیسا کہ 2002ء میں گجرات نے ہمیں دکھا دیا، وہ محروم لوگ جنہیں جذباتی تقریروں، دلکش کذب وافترا اور نفرت قوم کی خطرناک کاک ٹیل کے ذریعے قتل وغارت گری پر آمادہ کیا جا سکتا ہے۔

☆☆☆

پنجاب کی مثال

''خوشحالی کے باوجود تقسیم کے بعد والے پنجاب کی تاریخ لہو رنگ ہے۔۔۔ صرف دہلی میں تین ہزار سے زیادہ سکھوں کو زندہ جلا دیا گیا۔۔۔ میرے گھر پر پتھراؤ کیا گیا۔ تاہم گجرات کے واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ نہ تو ہندوستان کی پارٹیوں نے اور نہ ہی ہندوستانی عوام نے کوئی سبق حاصل کیا''۔

پنجاب کی مثال

ہر وہ شخص جو ہندوستانیوں میں فرقہ وارانہ جذبات کی مستقل موجودگی اور انہیں نظر انداز کر کے پروان چڑھنے کا موقع دینے یا ان کی حوصلہ افزائی کرنے کے المناک نتائج کو سمجھنے میں دلچسپی رکھتا ہے، اس کے لیے پنجاب ایک عمدہ کیس سٹڈی ہے۔ میں پنجاب کو مثال کے طور پر اس لئے استعمال کرتا ہوں کہ یہ اس برادری کا گھر ہے، جسے میں بہتر جانتا ہوں، اس کے علاوہ یہ وجہ بھی ہے کہ تاریخ کے تناظر میں دیکھا جائے تو پنجاب کسی دوسری ہندوستانی ریاست کی نسبت مذہبی جھگڑوں کا زیادہ شکار رہا ہے۔

آج کے پنجابی اپنے آباؤ اجداد کے چھوڑے ہوئے ورثے کے امین ہیں۔ انہوں نے وسطی ایشیاء اور اس سے پرے سے آنے والے حملہ آوروں کا سامنا کیا۔ تاریخ میں جن حملہ آوروں کے نام محفوظ ہیں ان میں سکندر اعظم کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ 1000ء کے بعد غزنوی، غوری، تغلق، لودھی اور مغلوں نے حملے کئے اور فتوحات پائیں۔ جب مغلیہ سلطنت ڈگمگانا شروع ہوئی تو نادر شاہ اور اس کے افغان جانشین آئے، احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر پے در پے نو حملے کئے۔ پنجابیوں نے ان تمام حملوں کا سامنا کیا اور ان کے نتیجے میں رونما ہونے والی تمام ذلتوں کو سہا۔ صدیوں کی تاخت و تاراج کے بعد پنجاب کے لوگوں کو سمجھ آئی کہ حملہ آوروں کی مزاحمت کرنے اور انہیں شکست دینے کے لئے اتحاد ضروری ہے۔

اگرچہ اس وقت تک خطے کے نصف سے زیادہ لوگ اسلام قبول کر چکے تھے، تاہم وہ

ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ اتحاد کرنے کے لئے تیار تھے۔اس میں ایک اہم عامل سکھ مذہب تھا، جو ہندو اور مسلمان برادریوں کو اکٹھا کرنے کے لیے وجود میں آیا تھا۔ اس لئے عقیدے نے دونوں مذاہب ہندومت اور اسلام سے تصورات مستعار لیے۔۔۔ایک عظیم الشان عمارت جسے ہندو اینٹوں اور مسلم گارے سے تعمیر کیا گیا تھا۔ سکھ مت کے بانی گرونانک (1539ء۔1469ء) دونوں برادریوں کی طرف سے قبولیت پانے کے لئے آئے تھے۔ایک عوامی شعر میں ان کے بارے میں کہا گیا ہے:

گرونانک شاہ فقیر

ہندو کا گرو، مسلمانوں کا پیر

پنجابی قومیت کی روح ''پنجابیت'' اس طرح پیدا ہوئی تھی۔ بلاشبہ اس نے تمام جھگڑے نہیں سلجھائے۔ درحقیقت سکھ جلد ہی مغلوں کے غصے کا نشانہ بن گئے۔ مغل سلطنت فطری طور پر سکھ گروؤں کی بڑھتی ہوئی مقبولیت پر متفکر تھی، جنہیں وہ سیاسی عزائم کے حامل مسلک کے رہنما تصور کرتی تھی۔ سکھ گروؤں اور ان کے پیروکاروں کی دارو گیر ہوئی۔اس کی وجہ واضح طور پر مذہبی سے زیادہ سیاسی تھی۔ پانچویں گرو ارجن کو مسلمان حکمرانوں نے لاہور میں سزائے موت دے دی۔اس کے بعد سکھ ایک عسکریت پسند فرقے میں تبدیل ہونے لگے۔آخری گرو گوبند سنگھ، جن کے والد گرو تیغ بہادر کو دہلی میں سزائے موت دی جا چکی تھی، کے دور میں یہ تبدیلی مکمل ہوگئی۔

ادھر برہمن ہندوؤں اور سکھوں میں بھی تناؤ موجود تھا۔ گرونانک کی بہت سے تعلیمات ہندو عقائد اور اعمال مثلاً بت پرستی، مذہبی رسوم اور ذات پات کے نظام کے خلاف ہیں۔ پنجاب کے اردگرد کے ہندو راجاؤں نے سکھوں کو ایک خطرہ سمجھا، اور بعض اوقات ان کا ڈر بجا بھی تھا۔ نتیجتاً انہوں نے سکھوں کے خلاف مغلوں کی مہمات میں ان کا ساتھ دیا۔ سکھ مؤرخ لکھتے ہیں کہ گرو ارجن جنہیں مغلوں نے سزائے موت دی، کے دشمنوں میں ایک ہندو ساہوکار بھی تھا، جس کی بیٹی کے ساتھ اپنے بیٹے کی شادی کرنے سے گرو ارجن

نے انکار کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ ایسا تاریخی ریکارڈ بھی موجود ہے جو بتاتا ہے کہ گرو گوبند سنگھ کے بیٹوں سے ان کے برہمن نوکروں نے غداری کی تھی۔ گرو گوبند سنگھ کے بیٹوں کو مغلوں نے گرفتار کر کے سزائے موت دے دی تھی۔

اس سب کے باوجود پنجاب میں مسلمانوں اور ہندوؤں اور سکھوں کے درمیان کوئی خلیج نہیں تھی۔ پنجابی قومیت کی روح زندہ تھی۔ اسی جذبے کے تحت مہاراجا رنجیت سنگھ نے ایک حقیقی پنجابی بادشاہت قائم کی۔ اس کے اہم مشیروں میں مسلمان، ہندو اور سکھ شامل تھے۔ اسی طرح اس کی فوج جسے تربیت یورپیوں نے دی، تینوں مذاہب کے پیروکاروں پر مشتمل تھی۔ اس کے توپخانے کا کمانڈر جنرل الٰہی بخش تھا، اس کے گھڑ سوار دستے زیادہ تر سکھ شاہسواروں پر مشتمل تھے، اس کی پیادہ فوج میں ہندو، سکھ، مسلمان اور گورکھے شامل تھے۔ جنرل دیوان چند نے اس کے لئے قلعہء ملتان کو فتح کیا۔ ہری سنگھ نلوہ اور اکالی پھولا سنگھ نے شمالی مغرب سرحد کے پریشان کر دینے والے قبائلیوں کو اطاعت پر مجبور کر دیا۔ پنجابی مسلمانوں نے اپنے پنجابی بھائیوں کے شانہ بشانہ مسلمان پٹھانوں اور افغانوں سے جنگ کی۔ یہ ایک غیر معمولی کارنامہ تھا۔ ہزار سال میں رنجیت سنگھ پہلا ہندوستانی تھا جس نے شمال مغربی سرحد سے امڈنے والی حملہ آوروں کی لہر کا زور توڑ دیا۔

جس سال رنجیت سنگھ فوت ہوا، اس کے مسلمان فوجیوں نے کرنل شیخ بساون کی قیادت میں کابل کی گلیوں میں رنجیت سنگھ کی فتح کے پھریرے لہراتے ہوئے پریڈ کی۔ دو سال بعد ایک ڈوگرا ہندو زور آور سنگھ نے رنجیت سنگھ کا جھنڈا تبت کے قلب میں گاڑا۔ یہ حقیقت بھی اہم ہے کہ جس واحد شخص نے رنجیت سنگھ پر قاتلانہ حملہ کیا وہ سکھ تھا۔

برطانیہ نے 1849ء میں سکھ سلطنت پر قبضہ کیا۔ انہوں نے پنجابی مسلمانوں اور سکھوں (صرف خالصوں) کے ساتھ ترجیحی سلوک کر کے ہندوؤں کو نظر انداز کیا اور یوں تینوں برادریوں میں تفریق پیدا کر دی۔ مسلمانوں اور سکھوں کو انتخابی اداروں میں ان کی تعداد کے مقابلے میں اضافی خصوصی نشستیں دی گئیں۔ فوج یا پولیس میں بھرتی کے لئے

پنجابی مسلمانوں اور خالص سکھوں کو "جنگجو نسلیں" (MARTIAL RACES) قرار دیا گیا جبکہ ہندوؤں کی صرف ایک چھوٹی سی ذات، موہیل برہمنوں کو "جنگجو نسل" قرار دیا گیا۔ برطانیہ نے تقسیم کے بیج بوئے اور تینوں برادریوں کو الگ الگ کر کے رکھ دیا۔

جب پورے ملک میں آزادی کی تحریک نے زور پکڑا تو پنجابی اس میں شامل نہیں ہوئے۔ ابتدا میں پنجاب کانگرس میں زیادہ تر شہری ہندو شامل تھے۔ 1920ء کی دہائی میں ہونے والے احتجاج کے بعد سکھوں نے بڑی تعداد میں کانگرس میں شمولیت اختیار کی۔ چند ایک قابل ذکر مستثنیات مثلاً ڈاکٹر عالم اور سیف الدین کچلو کے، پنجابی مسلمان کانگرس سے کنارہ کش رہے۔ آزادی کے وقت عمومی طور پر یہ صورت حال تھی۔ پنجابی مسلمان ملک کی تقسیم اور ایک آزاد ریاست پاکستان چاہتے تھے۔ پنجابی ہندوؤں اور سکھوں نے ان کی مخالفت کی اور نکالے گئے۔ پنجاب کو تقسیم کی بہت بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔ تقریباً دس لاکھ لوگ اپنی اراضی، گھروں اور اثاثہ جات سے ہاتھ دھو بیٹھے، جبکہ تقسیم کے ساتھ شروع ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات میں تقریباً دس لاکھ لوگ موت کے منہ میں چلے گئے۔

ہندوستان پچاس لاکھ پنجابی ہندو اور سکھ پناہ گزینوں کی آباد کاری کے قابل تھا۔ سکھ کاشتکاروں نے مشرقی پنجاب سے جانیں بچا کر فرار ہو جانے والے مسلمانوں کی املاک پر قبضہ کر لیا۔ سکھ کاشتکار نہروں سے سیراب ہونے والی زمینیں چھوڑ کر آئے تھے۔ یہاں انہیں کنوؤں سے سیراب ہونے والی زمینیں ملیں تاہم انہوں نے زبردست محنت کی۔ سکھ کاشتکاروں نے راجستھان کی بارانی بنجر زمینوں کو ہندوستان کی زرخیز ترین اراضی بنا دیا۔ مشرقی پنجاب میں، جو کہ ہندوستان کے حصے میں آیا تھا، 1962ء میں پنجاب زرعی یونیورسٹی کے قیام کے بعد گندم اور چاول کی اوسط پیداوار پورے پاکستان کی پیداوار سے تین گنا زیادہ ہو گئی۔ "سبز انقلاب" برپا کرنے میں سکھ کاشتکاروں کا نمایاں کردار تھا۔ یہ حقیقت زیادہ اہم ہے کہ جہاں پاکستان سے نقل مکانی کر کے آنے والے ہندوؤں اور سکھوں کو بغیر کسی مسئلے کے ہندوستانی مان لیا گیا، وہاں ہندوستان سے پاکستان ہجرت

کرنے والوں کو اب بھی مہاجر کہا جاتا ہے اور مقامی ان سے اختلاط نہیں کرتے۔ تاہم زیادہ اہم حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ نقل مکانی اور ہجرت کرنے والے پنجابی مفلسی کی انتہا کو پہنچ گئے تھے تاہم شاذ و نادر ہی کسی پنجابی کو بھیک مانگتا دیکھا گیا۔

خوشحالی کے باوجود تقسیم کے بعد والے پنجاب کی تاریخ لہو رنگ ہے۔ ہندو اور سکھ برادریوں میں خلیج پیدا ہوگئی۔ حالانکہ ان دونوں برادریوں میں ''روٹی بیٹی کے رشتے'' ہوتے تھے، یعنی وہ مل جل کر کھاتے تھے اور ایک دوسرے کے خاندانوں میں اپنی بیٹیوں کے رشتے کرتے تھے۔ جب سکھوں نے پنجابی بولنے والوں کی ایک الگ ریاست کا مطالبہ کیا تو ہندو فرقہ پرستوں نے بہت سے ہندوؤں کو قائل کر لیا کہ وہ مردم شماری میں ہندی کو اپنی مادری زبان درج کروائیں۔ سکھ درحقیقت ایک سکھ اکثریت والی ریاست چاہتے تھے اور انہوں نے زبان والی دلیل معاملے کی شدت کو کم کرنے کے لیے دی تھی۔ تاہم منطق ان کے حق میں تھی اور آخر طویل احتجاج کے بعد ان کا مطالبہ منظور کر لیا گیا۔ ہماچل اور ہریانہ کو پرانے پنجاب سے الگ کر دیا گیا اور خالصتاً پنجابی بولنے والوں کی ایک ریاست وجود میں آ گئی۔ آج کے پنجاب کی پنجابی بولنے والی آبادی میں سکھ ساٹھ فیصد ہیں جبکہ ہندو چالیس فیصد ہیں۔

تاہم پنجاب پر ہندو سکھ تناؤ آسیب بن کر چھایا رہا۔ 1980ء کی دہائی کے شروع میں جرنیل سنگھ بھنڈرانوالہ کی قیادت میں سکھ بنیاد پرستی کو ابھار ملا۔ بھنڈرانوالہ نے پنجابی ہندوؤں کے خلاف دہشت گردانہ کارروائیاں کیں۔ ہندوستانی تاریخ میں بھنڈرانوالہ باب سیاست کو مذہب سے الگ نہ رکھنے کے خطرناک نتائج کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ بھنڈرانوالہ کانگرس اور اکالیوں کی پیداوار تھا۔ اندرا گاندھی کو ذیل سنگھ نے مشورہ دیا تھا کہ اس کٹڑ سکھ پرچارک کو پنجاب میں اکالیوں کو محدود کرنے کے لیے لیڈر بنا دیا جانا چاہیے۔ بعدازاں اکالیوں نے بھنڈرانوالہ کو کانگرس سے الگ کرنے اور اسے اپنے ساتھ ملانے کی کوششیں کیں۔ سنت لونگووال نے اسے ایک مرتبہ ''ساڈا ڈنڈا'' قرار دیا تھا، جس سے

کانگرسی حکومت کی پٹائی کی جاتی تھی۔ ایک وقت آیا کہ وہ ایک عفریت بن گیا جس نے انہی لوگوں کو برباد کر دیا جنہوں نے اسے تخلیق کیا تھا اور پنجاب اور بیشتر ملک کو انتشار کا شکار بنا دیا۔

بھنڈرانوالہ کی سکھوں میں مقبولیت ہمارے دور کے لوگوں کے لیے ایک دلچسپ سبق ہے کہ جب ہندو بنیاد پرست درمیانے طبقے کے ہندوؤں میں، جو کہ اب ہمیشہ سے زیادہ آسودہ حال ہیں زیادہ مقبولیت حاصل کر رہے ہیں۔ چاہے اس بات پر یقین کیا جائے یا نہیں بھنڈرانوالہ کے عروج کی ایک اہم وجہ وہ خوشحالی تھی جو سبز انقلاب سے پنجاب میں پیدا ہوئی تھی۔ خوشحالی کے ساتھ اچانک تبدیلیاں آئیں: مغربی اثرات، تشخص کا بحران اور پستی۔۔۔ شراب نوشی، تمباکو نوشی، منشیات خوری، جوا بازی، عریاں فلمیں، جنسی بے راہروی۔ سب سے زیادہ عورتوں اور بچوں نے مصیبت جھیلی۔ اپنی اچانک خوشحالی کو سہار نہ سکنے والے کسانوں کی بیویوں اور بچوں کو بہت پریشانیاں سہنا پڑیں۔ اس صورت حال میں بھنڈرانوالہ منظر عام پر آیا۔ اس نے ان برائیوں کے خلاف پرچار کیا اور ''امرت پرچار'' کے عنوان سے ایک زبردست مہم شروع کی۔

وہ جہاں کہیں بھی گیا، ہزاروں سکھوں نے اس کے سامنے دوبارہ سکھ مت قبول کیا اور مذہبی اجتماعات میں عہد کیا کہ وہ دوبارہ کبھی شراب نوشی یا فحاشی کی طرف نہیں جائیں گے اور مغربی طور اطوار نہیں اپنائیں گے۔ انہوں نے اپنے عہد نبھائے۔ جو پیسہ پہلے ضائع ہوتا تھا، اب جمع کیا جانے لگا۔ جو وقت پہلے شراب نوشی اور منشیات خوری میں ضائع کیا جاتا تھا، اب زیادہ بہتر کاشتکاری میں صرف کیا جانے لگا۔۔۔ جس سے مزید پیسہ آیا۔ بھنڈرانوالہ نے سکھ کاشتکاروں کے ایک بہت بڑے حصے کو تباہی و بربادی سے بچا لیا۔

ان کاشتکاروں کی بیویوں اور بچوں نے بھنڈرانوالہ کو ایک ولی (SAINT) تسلیم کر لیا۔ بھنڈرانوالہ نے ایک مضبوط آدمی کا تصور دینے کے لئے اپنے بالوں بھرے سینے پر کارتوسوں سے بھری پٹی باندھنا اور کولہے کے ساتھ پستول لٹکانا شروع کر دیا۔ اس کے

ہاتھ میں مہاراجا رنجیت سنگھ کی طرح سونے کا ایک تیر ہوتا تھا۔ جب وہ اندرا گاندھی کو ''پنڈت دی دھی'' کہہ کر پکارتا تو ہجوم خوشی سے جھومنے لگتا۔ (''برہمن کی بیٹی'' کا خطاب اس خطاب کی نسبت نرم ہے، جو پراوین تو گاڈیا نے حال ہی میں سونیا گاندھی کو دیا ہے) وہ مرکزی حکومت کو ''بنیا ہندو سرکار'' کہا کرتا تھا۔ کالجوں سے فارغ التحصیل اور اپنے آباؤ اجداد کے کاشتکاری والے کام میں نہ کھپ سکنے والے بے روزگار نوجوانوں کو بھنڈرانوالہ کی آتشیں تقریروں نے متاثر کیا اور وہ اس کے پیروکار بننے لگے۔

بعد ازاں جب بھنڈرانوالہ گولڈن ٹیمپل میں منتقل ہو گیا تو اس نے ہندوؤں کے خلاف تقریریں کرنا شروع کیں اور اس کے پیروکار معصوم لوگوں کو قتل کرنے لگے۔ اس کے مداحوں نے ان الزامات کو حکومتی پروپیگنڈا قرار دے کر مسترد کر دیا۔ وہ اسے اب بھی ایک اچھا انسان تصور کرتے تھے۔ جب ہندوؤں کو بسوں سے نکال نکال کر قتل کیا جانے لگا اور پر ہجوم مارکیٹوں میں بم پھٹنے لگے تو سکھ تکبر اپنے عروج کو پہنچ گیا۔

1984ء میں ہندوستانی فوج امرتسر میں گولڈن ٹیمپل میں گھس گئی بھنڈرانوالہ کے پیروکاروں اور فوج کے درمیان خونریز تصادم ہوا۔ فوج نے اکال تخت کو تباہ کر دیا۔ تقریباً پانچ ہزار مرد اور عورتیں فوج اور بھنڈرانوالہ کے آدمیوں میں کراس فائر کی زد میں آ کر ہلاک ہو گئے۔ ان میں سے اکثریت بے گناہ زائرین کی تھی جو اس ٹیمپل کے بانی گرو ارجن دیو کا یومِ شہادت منانے کے لیے وہاں اکٹھے ہوئے تھے۔ چند ماہ بعد 31، اکتوبر کو اندرا گاندھی اپنے ایک سکھ باڈی گارڈ کے ہاتھوں ماری گئی۔ اس کا نتیجہ انتہائی ہولناک اور دہشت انگیز نکلا۔ پورے گنگا کے میدان میں کرناٹک تک شہروں اور قصبوں میں کانگرسی رہنماؤں کی زیر قیادت مشتعل لوگوں نے سکھوں کا زبردست جانی اور مالی نقصان کیا۔

صرف دہلی میں تین ہزار سے زیادہ سکھوں کو زندہ جلا دیا گیا اور ستر سے زیادہ گوردواروں کو مسمار کر دیا گیا۔ 31، اکتوبر کی سہ پہر میں نے کناٹ سرکس سے کالے دھوئیں کا بہت بڑا بادل اٹھتا دیکھا۔ اس علاقے میں سکھوں کی املاک کو آگ لگا دی گئی تھی۔ شام کو

میں نے دیکھا کہ غنڈوں نے ایمبیسڈر ہوٹل کے باہر کھڑی سکھوں کی ٹیکسیوں کو توڑ پھوڑ دیا۔ خان مارکیٹ میں سکھوں کی دکانوں کو تباہ کر دیا گیا، میرے گھر پر پتھراؤ کیا گیا۔ میں نے سڑک کے پار پولیس والوں کی دو صفوں کو اپنے افسر کی قیادت میں کھڑے دیکھا۔ وہ سب مسلح تھے۔ مگر خاموشی سے فسادیوں کو لوٹ مار کرتے دیکھ رہے تھے۔

آدھی رات کو میں نعروں کے شور سے جاگ گیا: ''خون کا بدلہ خون سے لیں گے''۔ میں دوڑا دوڑا اپنے عقبی باغ میں گیا اور جھانک کر دیکھا۔ مجھے ٹرک بھر آدمی لاٹھیوں اور مٹی کے تیل کے کنستروں سے مسلح نظر آئے۔ انہوں نے سبحان سنگھ پارک گوردوارے پر حملہ کر دیا اور سکھ مکینکوں کی دکانوں کے باہر مرمت کے لئے کھڑی کاروں کو آگ لگا دی۔

بھنڈرانوالہ کے آدمی پنجاب میں معصوم ہندوؤں کے ساتھ جو کچھ کر رہے تھے، اس کے نتیجے میں سکھوں کے خلاف اچانک غصہ پھٹ پڑنے کی مجھے توقع تو تھی تاہم دہلی میں جو کچھ ہوا، منظم انداز میں ہوا۔ پوری کی پوری حکومتی مشینری رضاکارانہ فالج کا شکار ہو گئی۔ نہ کرفیو لگایا گیا، نہ بلوائیوں کو دیکھتے ہی گولی مارنے کے احکامات پر عمل کیا گیا۔

یہ فرقہ وارانہ فسادات نہیں تھے کیونکہ بہت سے مقامات پر ہندوؤں نے اپنے سکھ ہمسایوں کو بچایا۔ اس کے علاوہ پنجاب میں سکھوں نے ہندوؤں پر جوابی حملے بھی نہیں کئے۔ صرف ایک پارٹی پر واضح شبہ تھا کہ اس نے ''سکھوں کو سبق سکھانے'' کا اشارہ کیا ہے۔ 133 سال پہلے اپنی سلطنت گنوانے کے بعد 1984ء کا سال سکھوں کے لئے سب سے زیادہ برا تھا۔ اس منظم قتل عام کے برسوں بعد بھی کسی کو مجرم قرار نہیں دیا گیا۔ دو دن میں رونما ہونے والے واقعات پر کئی کمیشن بنائے گئے۔

جسٹس تارکنڈے، ڈاکٹر کوٹھاری اور سپریم کورٹ کے ریٹائرڈ چیف جسٹس ایس۔ ایم۔ سیکری جیسے ممتاز اشخاص کی زیر قیادت تحقیق کرنے والے غیر سرکاری کمیشنوں نے واضح طور پر اس وقت کی حکومت کو ان فسادات کا ذمہ دار قرار دیا۔ حتیٰ کہ انہوں نے کانگریس کے متعدد ایسے اراکینِ پارلیمنٹ کے نام بھی درج کئے ہیں جنہوں نے ایک بے بس اقلیت

کے خلاف تشدد کو ہوا دی حالانکہ اس اقلیت کو ہندوؤں کے ساتھ اپنے مراسم میں کبھی عدم تحفظ کا معمولی سا بھی احساس نہیں ہوا تھا۔ تاہم سرکاری کمیشن نے کانگرس اور حکومت کو ہر الزام سے بری الذمہ قرار دیا۔ آج کانگرس کے وہ رہنما آزاد پھر رہے ہیں جنہوں نے قاتلوں اور لٹیروں کی قیادت کی تھی۔

ہندوستان نے 1984ء میں ایک بھاری قیمت چکائی ہے۔ تاہم گجرات کے واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ نہ تو ہندوستان کی پارٹیوں نے اور نہ ہی ہندوستانی عوام نے ان سے کوئی سبق حاصل کیا۔ تاریخ کو دہرائے جانا ہی ہمارا مقدر ہے۔

☆☆☆

صرف بی جے پی ہی نہیں

''بی جے پی نے جس انتہا پسندی اور شاونیت کو عروج پر پہنچایا ہے اس کا آغاز کانگرس نے کیا تھا۔۔۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ بی جے پی کے اقتدار میں آنے کے بعد مسلمانوں کو ہمیشہ سے زیادہ ظلم وستم کا نشانہ بنایا گیا ہے۔۔۔انہوں نے اس امر کا اہتمام کیا کہ مسلمان بھی دلتوں کی طرح مفلس اور غیر محفوظ رہیں''۔

صرف بی جے پی ہی نہیں

اس امر کو یاد رکھنا ہم سب کے مفاد میں ہے کہ بی جے پی نے جس انتہا پسندی اور شاونیت کو عروج پر پہنچایا ہے اس کا آغاز کانگرس نے کیا تھا۔ گجرات سے پہلے پولیس کی دہشت گردی سے چشم پوشی کی بدترین مثال مسز گاندھی کے قتل سے اگلے دو دنوں کے دوران دیکھنے میں آئی۔ پولیس کے ایک ریٹائرڈ ڈائریکٹر جنرل این۔ایس۔سکسینہ نے اپنی کتاب TERRORISM: History and Facts in the World and in India میں لکھا ہے:

> ''دہلی، کانپور، غازی آباد وغیرہ کی پولیس کا تاثر یہ تھا کہ سکھوں کے خلاف بلوؤں کو حکومت کی منظوری حاصل ہے۔''

اس وقت کے وزیر داخلہ نے پارلیمنٹ میں تسلیم کیا کہ صرف دہلی میں 2400 سے زیادہ افراد قتل ہوئے ہیں (حقیقی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے)۔ دہلی پولیس نے صرف 359 رپورٹیں درج کیں۔ مجسٹریسی نے بھی ایسی ہی مجرمانہ غفلت سے کام لیا اور اپنے فرائض سے کوتاہی برتی۔ ناقابل ضمانت الزامات کے ننانوے فیصد ملزموں کو ضمانت پر رہا کر دیا گیا اور انہوں نے مقتولین کے ورثا کو دہشت زدہ کیا اور اپنے خلاف گواہی نہ دینے پر مجبور کیا۔ سکسینہ نے دانش مندی کے ساتھ تبصرہ کیا: ''دہشت گردی کافی حد تک سرکاری شعبے کا کاروبار رہی ہے۔''

جس دہشت گردی پر آہنی ہاتھوں سے صرف چند گھنٹوں ہی میں قابو پایا جا سکتا تھا

اُسے بہتر گھنٹے جاری رہنے کی شعوری طور پر چھوٹ دی گئی۔ اس کی مذمت کرنا تو درکنار راجیو گاندھی نے وزیراعظم کی حیثیت سے اپنی پہلی تقریر میں کہا:

''جب کوئی بڑا درخت ٹوٹتا ہے تو زمین ہل جاتی ہے۔''

ان فسادات کے بعد ہونے والے انتخابات میں کانگرس کا طرزِ عمل اتنا ہی لائق مذمت تھا۔ کانگرس کے انتخابی پوسٹروں میں واضح طور پر سکھ دشمن تعصب سے کام لیا گیا تھا۔ اسی طرح کے ایک اشتہار کی عبارت یہ تھی: ''کیا آپ کسی ایسی ٹیکسی میں اپنے آپ کو محفوظ تصور کرتے ہیں، جسے کسی دوسری کمیونٹی کا فرد ڈرائیو کررہا ہو؟'' خود راجیو کو اپنے حلقے امیٹھی میں اپنی سکھ سالی مانیکا سے انتخابی مقابلہ کرنا پڑا۔ اس کی انتخابی مہم میں لگائے جانے والے نعروں میں سے ایک نعرہ تھا: ''بیٹی ہے سردار کی، قوم ہے غدار کی''۔ کانگرس پارٹی نے سکھ دشمن جذبات کو بھڑکا کر زبردست کامیابی حاصل کرلی۔

تاہم کانگرس کی حکمرانی میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات صرف 1984ء میں نہیں ہوئے تھے۔ جن جن ریاستوں میں کانگرس نے حکومت کی ہے، اُن کا ریکارڈ بھی داغدار ہے۔ ہاشم پورہ میں ستر سے زیادہ مسلمانوں کو گولی ماردی گئی۔ احمد آباد، بھیوانڈی اور جل گاؤں، مدھیہ پردیش کے قصبوں اور بھاگل پور میں ہونے والے مسلم کش فسادات نے کانگرس کے سیکولرازم کے دعوؤں کو جھوٹ ثابت کردیا ہے۔

آپ کو سیاسی پارٹیوں کے ظاہری دعوؤں اور اعلیٰ آدرشوں کے حامل منشوروں سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔ آپ کو ان کے اعمال و افعال کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرنا چاہیے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ بی جے پی کے اقتدار میں آنے کے بعد مسلمانوں کو ہمیشہ سے زیادہ ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا ہے۔

تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ انہیں کانگرس کے دورِ اقتدار میں بھی سکھ کا سانس نہیں لینے دیا گیا۔ اندرا گاندھی اور اس کے بعد راجیو گاندھی نے مسلمانوں کو محض ووٹ بینک کے طور پر استعمال کیا۔ انہوں نے اس امر کا اہتمام کیا کہ مسلمان بھی دلتوں کی طرح مفلس اور غیر

محفوظ رہیں تاکہ وہ کانگریس کو اپنی واحد نجات دہندہ تصور کرتے رہیں۔

مجھے 1970ء کے عشرے کے وسط میں علی گڑھ کا ایک دورہ یاد ہے۔ میں نے جو کچھ وہاں دیکھا، اس سے واضح ہو گیا کہ کانگریس نے پورے ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ کیا کیا ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں مختصر سے قیام کے بعد دہلی واپس آتے ہوئے میں نے مسلمان کاشتکاروں کی ''ترقی'' کی ایک جھلک دیکھی۔ غازی آباد سے کچھ میل دور کچھ بستیاں تھیں، جن کی ساری آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ میں سب سے بڑی بستی میں گیا۔ اس کا نام داسنا تھا۔ اس بستی کی آبادی 2300 افراد پر مشتمل تھی۔ گھر تو کافی صاف ستھرے دکھائی دیئے تاہم گلیاں ناقابل یقین حد تک غلیظ تھیں۔ گندے پانی کی نالیوں میں انتہائی بدبودار کیچڑ بھری ہوئی تھی، جس کی وجہ سے گندا پانی گلی میں بہہ آیا تھا۔ گلیوں میں بہت کم بجلی کے بلب لگے ہوئے تھے۔

اگرچہ ہر شخص قریب قریب آباد تھا تاہم مسجد کے مینار پر ایک لاؤڈ سپیکر نصب تھا۔ میں نے داسنا میں صرف ایک سکول دیکھا، ایک ہائی سکول۔ مجھے بتایا گیا کہ اس سکول میں صرف تمیں بچے پڑھنے آتے ہیں۔ ایک نوجوان نے، جس کا خاندان پورے علاقے کے ٹریکٹر کے مالک صرف تین خاندانوں میں سے ایک تھا، مجھے کہا:

''وہ پڑھ کر کیا کریں گے؟ وہ مسجد میں قرآن شریف پڑھتے ہیں، بس اتنا ہی کافی ہے۔ اور ہم لڑکیوں کو پڑھانے کے قائل نہیں ہیں۔'' میرے ساتھ آئے ہوئے تحصیل داروں نے بتایا کہ اس علاقے میں بہبود آبادی کی گزشتہ مہم کے دوران داسنا اور اس کے ارد گرد کی تمام بستیوں کے کسی ایک مرد یا عورت نے بھی خود کو رضا کارانہ طور پر نس بندی کے لئے پیش نہیں کیا۔

کانگریس نے مسلمانوں کی سادہ لوحی، پسماندگی، مذہب پر سختی سے عمل کرنے کی عادت اور تعلیم کی کم شرح کی وجہ سے استحصال کرتے ہوئے اس کمیونٹی کو ایک دانشورانہ اور سماجی گیٹو بنا ڈالا ہے۔ مسلمانوں نے اپنے ذہنوں کو بند کر لیا ہے۔ وہ کچھوے کی طرح اپنے ہی خول

میں سکڑ گئے ہیں۔ بی جے پی نے اس صورتِ حال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مسلمانوں کو بے رحمی کے ساتھ غیر انسانی مظالم کا نشانہ بنایا ہے۔

☆☆☆

تلخ حقیقت

''غیر مسلموں نے ہمیشہ مسلمانوں کو متعصب، جنونی اور غدار تصور کیا ہے۔۔۔ جناح نے دوقومی نظریہ پیش کیا تو وہ غلط نہیں تھے۔۔۔ ہم اپنے مذہب کی خامیوں کو دیکھنے سے قاصر ہیں۔۔۔ جب ہم اپنے اندر کے شریر لوگوں کو دیکھ لیں گے تب ہم اپنے مستقبل کے تحفظ کی طرف پہلا قدم بڑھائیں گے''۔

تلخ حقیقت

مسلمانوں کا رویہ صرف ایک سیاسی نہیں بلکہ قومی مسئلہ ہے۔ ہم نے 1947ء کے بعد انہیں قومی مرکزی دھارے میں لانے کی کوشش ہی نہیں کی۔ غیر مسلموں نے ہمیشہ مسلمانوں کو متعصب، جنونی اور غدار تصور کیا ہے۔ ہمیں بچپن میں پرتھوی راج چوہان، مہارانا پرتاب، گرو گوبند سنگھ اور چھتر پتی شیوجی کی کہانیاں سنائی گئیں۔ ہمارے سب ہیرو غیر مسلم تھے، جنہوں نے مسلمانوں سے جنگیں لڑی تھیں۔ ہماری دیو مالا میں کوئی ایک بھی مسلمان نہیں تھا۔ اکبر محض ایک نمائشی شخصیت تھا۔ ہمیں صرف یہی بتایا جاتا تھا کہ مسلمان فاتحین نے ہمارے مندر مسمار کیے، ہمارے لوگوں کو ہلاک کیا اور جزیہ وصول کیا۔ اگرچہ برطانیہ کی حکومت قائم ہونے کے بعد یہ سب ختم ہو گیا مگر ہم نے مسلمانوں پر بے اعتمادی جاری رکھی۔ چند زیادہ لبرل غیر مسلموں نے مسلمانوں سے دکھاوے کی دوستی قائم کی، تاہم ان کی موجودگی میں نہ تو ہم سکون محسوس کرتے تھے نہ کھل کر بات کرتے تھے۔ ہم نے ان سے ہمیشہ منافقت برتی۔ وہ ہندوستانی مرکزی دھارے کا حصہ نہیں تھے۔ محمد علی جناح کو دو قومی نظریہ وضع نہیں کرنا پڑا تھا، یہ تو ہر ایسے شخص کے لیے پہلے سے موجود تھا، جو آنکھیں رکھتا ہو۔ ہم ہی تھے جنہوں نے مسلمانوں کو ایک الگ قوم بنائے رکھا۔ ہم نے ہی انہیں تہذیبی، معاشی اور سیاسی اعتبار سے ایک الگ اکائی قرار دیئے رکھا۔ چنانچہ جناح نے دو قومی نظریہ پیش کیا تو وہ غلط نہیں تھے کیونکہ ان سے پہلے ہم خود عملی طور پر مسلمانوں کو ایک الگ قوم تصور کرتے تھے۔ انگریز برادریوں کے درمیان فاصلے کو بھانپنے میں بہت تیز تھے اور ہر غیر ملکی

طاقت کی طرح انہوں نے اُسے اپنے مفاد میں استعمال کیا۔

ستم ظریفی تو یہ ہے کہ زعفرانی لباس میں ملبوس ان قوم پرستوں نے بھی وہی کیا جو انگریزوں نے ہم پر حکومت کرنے کے لیے کیا تھا۔ وہ مسلمانوں کو محدود رکھنے کے لئے جو کچھ ان کے اختیار میں ہے، کریں گے تاکہ وہ "دوسرے" رہیں۔ اس سے ہندو بنیاد پرست بڑی آسانی کے ساتھ ہم سے جھوٹ بول سکتے ہیں۔ وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ ایک سے زیادہ شادیاں کرنے والے مسلمان اپنی تعداد کو اتنی خطرناک شرح سے بڑھا رہے ہیں کہ ہندو ایک اقلیت بن کر رہ جائیں گے۔ ستم تو یہ ہے کہ ہم ان کی ایسی بے پر کی باتوں پر یقین کر لیتے ہیں حالانکہ مردم شماری کے نتائج واضح طور پر بتاتے ہیں کہ ہندو آبادی میں اضافے کی شرح ہمیشہ اونچی رہی ہے۔ وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ مسلمان حکمران اپنی ہندو رعایا کی نسل کشی کرتے تھے، حالانکہ یہ تاریخ کی مصدقہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں نے ہندوستان میں ہندوؤں کی نسبت مسلمانوں کا لہو زیادہ بہایا ہے۔ وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ آج کے مسلمان ہندوستان کے حکمران نہ ہونے پر پچھتاوے کا شکار ہیں اور عدم رواداری اور تشدد پسند ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آزادی کے بعد ہونے والے ہر فرقہ وارانہ تصادم میں مسلمانوں کا جانی و مالی نقصان ہندوؤں کی نسبت دس گنا زیادہ ہوا ہے۔

بی جے پی بہت سے ہندوؤں کو قائل کرنے میں کامیاب رہی ہے کہ کانگرس کے پورے دورِ اقتدار میں مسلمانوں کو لاڈ پیار سے رکھا گیا اور یہ کہ کانگرس ان کی حمایت کرتی تھی۔ میں پہلے ہی نشاندہی کر چکا ہوں کہ کانگرس نے مسلمانوں سے حقیقتاً کیسا لاڈ پیار کیا تھا۔ مزید ثبوت کے طور پر میں دوبارہ جج میڈن کی رپورٹ کا حوالہ دوں گا۔ جج میڈن نے مذکورہ رپورٹ بھیونڈی میں ہونے والے فسادات کے بعد پیش کی تھی۔ اس وقت مرکز اور مہاراشٹر میں کانگرس کی حکومت تھی۔ ان فسادات میں ایک سو اکیس افراد ہلاک ہوئے، جن میں سو سے زیادہ مسلمان تھے، جتنی لوٹ مار ہوئی، اس کا نوے فیصد نشانہ مسلمان بنے۔ اس کے باوجود کہ مسلمان ستم رسیدہ تھے، ان کی بہت بڑی تعداد کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے برعکس

چند ایک ہندوؤں کو ہی گرفتار کیا گیا۔ مہاراشٹر پولیس نے مسلمانوں کے خلاف تعصب کا مظاہرہ کر کے اپنی وردی کے وقار کو خاک میں ملا دیا۔ انہوں نے مسلمان قیدیوں پر بے پناہ تشدد کیا اور ان کا کھانا پانی چھین کر ہندو قیدیوں کو دے دیا۔ جج میڈن کی رپورٹ یہ بھی انکشاف کرتی ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات سے نمٹنے کے لیے وزارتِ داخلہ کے جاری کردہ ایک سرکلر میں مسلمانوں کو فرقہ وارانہ تناؤ بڑھانے والے قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ بیشتر غیر مسلم ان پر الزام لگاتے ہیں۔ مذکورہ سرکلر میں کہا گیا تھا کہ مسلمانوں کی نقل وحرکت پر کڑی نظر رکھی جائے۔

دائیں بازو کے ہندوؤں نے عیسائیوں کو بھی نشانہ بنایا ہے۔ انتہا پسند ہندو ہمیں بتاتے ہیں کہ عیسائیوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو رہا ہے جس کی وجہ ہندوؤں کا عیسائی ہونا ہے۔ ستم تو یہ ہے کہ ہم میں سے بہت سے لوگ اس بات کو سچ بھی مانتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہندوستان میں عیسائیوں کی تعداد میں کمی ہوئی ہے۔ اور انتہا پسند ہندو یہ کیوں نہیں تسلیم کرتے کہ مشنریوں نے ان کی نسبت زیادہ اچھے کام کئے ہیں۔ عیسائی مشنری صرف زبانی کلامی پرچار تک ہی محدود نہیں رہے بلکہ انہوں نے پورے ملک میں بہترین قسم کے سکول، کالج اور ہسپتال کھول کر اپنے عقیدے کو عمل کا روپ دیا ہے۔ ہمارے ملک میں اکثر رونما ہونے والے قدرتی المیوں میں عموماً عیسائی امدادی کارکن متاثرہ افراد کی مدد کے لئے پہنچتے ہیں۔ وہ ان بیمار افراد کی خدمت کرتے ہیں، جن کو ہمارا معاشرہ دھتکار دیتا ہے۔

الزام لگایا جا رہا ہے کہ عیسائی ادارے اس حقیقت سے حوصلہ پا کر اپنی سرگرمیاں بڑھا رہے ہیں کہ سونیا گاندھی جو اقتدار کی کشمکش میں شامل ہو چکی ہے، کیتھولک ہے۔ یہ سراسر بکواس ہے۔ راجیو سے شادی کے بعد سونیا نے اپنی تقدیر اپنے خاوند کی کمیونٹی سے منسلک کر دی تھی اور لاکھوں غیر عیسائیوں کی طرح مدر ٹیریسا (TERESA) کو خراجِ عقیدت ادا کرنے کے علاوہ وہ مذہبی تنظیموں سے دور رہی۔ اس نے ہندوستان کو اپنا گھر منتخب کیا اور اپنے بچوں کی ہندو کے طور پر پرورش کی، حالانکہ اسے انہیں عیسائیوں کے طور پر پروان

چڑھانے کا پورا پورا حق تھا۔

ارون شوری اور پرافل گورادیا نے اپنی کتابوں اور کالموں میں ایسے ہی جھوٹے دلائل اور من گھڑت باتیں لکھی ہیں۔ وہ ذہین اور وسیع المطالعہ افراد ہیں اور اگر وہ مصدقہ حقائق کی بجائے ہمیں جھوٹی باتیں سناتے ہیں تو وہ ایسا ایک مقصد کے تحت کرتے ہیں۔ ان کا مقصد اکثریتی کمیونٹی میں نفرت پھیلا کر، اختلافات پر زور دے کر اور خدشات کو بڑھا کر انتخابات میں فتح حاصل کرنا ہے۔

آرتھر کوئسلر اپنی کتاب SUICIDE OF A NATION میں خوبصورت انداز میں کہتا ہے:

> ''ماضی کے مصوروں اور ادیبوں نے کیمرا (CHIMAERAS) تخلیق کیے ہیں۔ یہ ایک عفریت ہوتا ہے جس کا سر شیر کا، دھڑ بکری کا اور دم اژدہے کی ہوتی ہے۔ خود میری پسندیدہ تخیلاتی تخلیق مومیفینٹ (MOMIPHANT) ہے۔ وہ ایک ایسی مخلوق ہے جس سے ہم میں سے بیشتر لوگ اپنی زندگی میں مل چکے ہیں۔ وہ ایک مخلوط مخلوق ہے، جس میں میموسا (MIMOSA) کی سی نزاکت ہے کہ جب اس کے اپنے محسوسات کو ٹھیس پہنچتی ہے تو وہ ایک لمس سے ہی ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے اور اس میں ہاتھی جیسی بے حسی بھی ہے کہ یہ دوسروں کے محسوسات کو اپنے پیروں تلے روند دیتی ہے۔''

میرے نزدیک شوری اور گورادیا کلاسیک مومیفینٹ ہیں۔ وہ ہندوستان کو تباہ کر دیں گے۔ ہم نے اپنے تعصب کی طویل تاریخ سے ٹکراؤ نہ لے کر ایسے لوگوں کی مدد کی ہے۔ ہر ہندوستانی برادری نے خود کو دوسروں سے الگ تھلگ رکھا ہے۔ آج ہمیں اس حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہیے۔ فرقہ وارانہ تناؤ کے ختم کرنے کا روایتی طریقہ ''رام رحیم'' یا ''ایشور اللہ تیرو نام'' والی سوچ ہے یعنی یہ پرچار کرنا کہ سب مذاہب انسانوں سے محبت کی تلقین کرتے

ہیں۔ یہ سوچ اس وقت کارگر تھی جب ہمارے درمیان مہاتما گاندھی جیسے لوگ تھے کیونکہ انہوں نے اپنی شخصیت کو اس سانچے میں ڈھال لیا تھا۔ آج یہ سوچ کارگر نہیں ہے۔ سی۔ راج گوپال اچاری کہا کرتے تھے کہ بھگوان ہمارا بہترین سپاہی (POLICEMAN) ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ایک سچے مذہبی انسان کے اندر نفرت نہیں ہوتی۔ تاہم ایسے انسان تو اب خواب خیال ہو چکے ہیں جبکہ مذاہب کے درمیان اختلافات پر زور دے کر اپنی مذہبیت کی نمائش کرنے والے لوگ بہت زیادہ ہو چکے ہیں۔ ہم میں سے بیشتر لوگ فیصلے کے دہرے معیارات رکھتے ہیں یعنی ہم اپنے مذہب کی خامیوں کو دیکھنے سے قاصر ہیں اور دوسرے لوگوں کے عقیدوں میں مین میخ نکالنے کے بے حد شائق ہیں۔ رام رحیم والی سوچ تو محض ایک دھوکا ہے۔

جب ہم اپنے اندر کے شریر لوگوں کو دیکھ لیں گے تب ہم اپنے مستقبل کے تحفظ کی طرف پہلا قدم بڑھائیں گے۔

☆☆☆
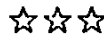
کیا کوئی حل ہے؟

''مذہب کے پروپیگنڈے کے لیے آل انڈیا ریڈیو اور دور درشن کا غلط استعمال لازماً روک دیا جانا چاہیے۔۔۔اگر کوئی علاقہ ہندو اکثریت والا ہو تو وہاں پولیس میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہونی چاہیے۔۔۔فسادیوں کے خلاف مقدمے فوری سماعت والی عدالتوں میں چلائیں۔۔۔اپنے بھجن اور شبد گاؤ مگر اپنے گھروں میں یا اپنی عبادت گاہوں کے اندر''۔

کیا کوئی حل ہے؟

جتنی ہماری تعداد بڑھتی ہے، اتنا ہی ہمارے مسائل میں اضافہ ہوتا ہے۔ مجھے کامل یقین ہے کہ ہندوستان میں بڑھتی ہوئی فرقہ وارانہ کشیدگی کی وجہ ہماری آبادی میں اضافے کی خودکش شرح ہے۔ ہمارے شہروں اور چھوٹے قصبوں کی آبادی خوفناک حد تک بڑھ چکی ہے۔ یہاں لاکھوں لوگ انتہائی غلیظ اور آلودہ ماحول میں رہتے ہیں۔ وسائل کی قلت ہے اور ملازمتیں عنقا ہیں۔ فطری سی بات ہے۔ ذرا سی تحریک پر کشیدگی جنم لے لیتی ہے۔ لوگ فوراً مشتعل ہو جاتے ہیں اور تشدد پر اتر آتے ہیں۔ ایسے شخص کی مخالفت کی بجائے کہ جس سے تمہیں کوئی خدشہ ہو، تمہارا اپنی کمیونٹی کے افراد کے ساتھ مل جتھہ بندی کر لینا اور ان لوگوں کے پیچھے پڑ جانا آسان ہے، جو کہ تمہاری کمیونٹی سے تعلق نہیں رکھے۔

ہر کمیونٹی کے فرقہ پرست گروہوں نے ہمیشہ اس بات کا فائدہ اٹھایا ہے۔ فرق اب یہ ہے کہ ہندو فرقہ پرست گروہ ہندوؤں کو متحد کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ ہندو ملکی آبادی کا بیاسی فیصد ہیں لیکن روایتی طور پر متعدد باہم دست و گریباں ذاتوں اور لسانی گروہوں میں تقسیم رہے ہیں۔ انتہا پسند ہندو انہیں ایک مشترکہ دشمن کے خلاف متحد کر رہے ہیں۔ ان انتہا پسندوں کے بقول یہ مشترکہ دشمن ''غیر ملکی'' ہیں۔ یعنی مسلمان اور عیسائی۔ وہ کہتے ہیں کہ انہیں یا تو غلامانہ حیثیت میں رہنے پر مجبور کیا جائے یا ان کی اکثریت کو تہِ تیغ کر دیا جائے یا ملک سے نکال دیا جائے۔

گجرات میں ہم نے دیکھ لیا ہے کہ سنگھ نے کس طرح غریبوں اور بے روزگاروں

کے خدشات کو مستقل طور پر عدم تحفظ کے شکار اور سنی سنائی باتوں پر یقین کر لینے والے درمیانے طبقے کو اپنا شیطانی ایجنڈا پورا کرنے کے لئے استعمال کیا۔ ہندوستان میں معاشی محرومیوں کی وجہ سے تشدد کے امکانات ہمیشہ موجود رہے ہیں اور اقلیتیں ہمیشہ اس قسم کے تشدد کا نشانہ بنی ہیں۔ مراد آباد میں ہونے والے فسادات کو دوسرے شہروں سے آنے والوں نے بھڑکایا تھا جو پیتل کے برتنوں کی صنعت پر مسلمانوں کی اجارہ داری کو توڑنا چاہتے تھے۔ جل گاؤں اور بھیونڈی (مہاراشٹر) میں بھی ایسا ہی ہوا تھا کہ جہاں باہر سے آنے والوں، خصوصاً سندھی اور پنجابی ہندوؤں نے مسلمان جولاہوں کے کاروبار ہتھیانے کے لئے انہیں تباہ و برباد کر دیا۔ پنجاب میں سکھ دہشت گردی پر ہریانہ کے ہندوؤں نے یوں ردِ عمل ظاہر کیا کہ پانی پت، کرنال اور یمنا نگر میں سکھ دکانداروں کو نشانہ بنایا گیا۔ فساد زدہ حیدر آباد میں ہندو بلوائیوں نے مسلمانوں کی املاک کو نقصان پہنچایا، جس میں ایک مسلمان کی ملکیت ایسی عمارت بھی شامل تھی جس میں کھڈیوں پر کپڑا بنا جاتا تھا۔ ان تاریخی حقائق کی روشنی میں جب گجرات کے واقعات کو دیکھا جاتا ہے تو حیرت نہیں ہوتی کہ مسلمانوں کی ملکیتی دکانوں اور فیکٹریوں کو جلا دیا گیا جبکہ بستیوں میں آدی واسیوں نے مسلمان ساہوکاروں کو لوٹنے کی کھلی چھوٹ دے دی گئی۔

اس مسئلے کی سنگینی میں اضافے کرنے والا ایک اور عامل ہے تعلیم یافتہ بے روزگاروں کی تعداد میں مسلسل اضافہ۔ پنجاب میں دہشت گردوں کی اکثریت تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں پر مشتمل تھی۔ کشمیر کا بھی یہی معاملہ ہے۔ گجرات میں بہت سے ہندو دہشت گرد، جنہوں نے اپنے ہم وطن ہندوستانیوں کو قتل کیا اور عورتوں کی عصمت دری کی، وہ بھی بے روزگار نوجوان تھے۔ وہ بینکوں کو لوٹ کر، امیروں سے دولت چھین کر اور دہشت پھیلا کر اپنے آپ کو طاقتور محسوس کرتے ہیں۔

منظر خوفناک ہے اور ہر گزرتے دن کے ساتھ مزید خوفناک ہو رہا ہے۔ اس سلسلے میں کیا کیا جا سکتا ہے؟

پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمیں اس کے ساتھ جینا سیکھنا پڑے گا۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں ہم فرقہ واریت کے ختم ہونے کی دعا نہیں کر سکتے۔ ہم یہ دکھاوا نہیں کر سکتے کہ فرقہ وارانہ اختلافات محض فسادات کے دوران دکھائی دیتے ہیں اور بصورتِ دیگر وجود نہیں رکھتے۔ وہ ہمیشہ موجود رہے ہیں اور مستقبل میں بھی رہیں گے۔ لہٰذا ہم سب کو، ہندوؤں کو، مسلمانوں کو، عیسائیوں کو اور سکھوں کو لازماً دوسری کمیونٹیوں کے حوالے سے یک رخے تصورات پر کسی نہ کسی حد تک لازماً غالب آنا ہوگا۔ ہمیں کمیونٹی کی بنیاد پر بننے والی ہاؤسنگ سوسائٹیوں، سکولوں اور کلبوں سے دور رہنا ہوگا۔ ہندوؤں اور سکھوں کو اس حقیقت کا ادراک ضرور کرنا ہوگا کہ ہندوستان کے مسلمانوں سے ماضی کے بعض حکمرانوں کی غلطیوں کا بدلہ لینا ناانصافی ہے کیونکہ درحقیقت وہ حکمران مذہب سے زیادہ اپنی سلطنتوں کو بچانے کے لیے فکرمند تھے۔ ہندوستان پر مسلمانوں کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کسی دوسری کمیونٹی کا۔ اگر مسلمان غیر ملکی ہیں تو ہم سب بھی غیر ملکی ہی ہیں۔ صرف آدی واسی ہی ہندوستان کے اصل باشندے ہیں، جنہیں ہم سب نے نابود کر دیا ہے۔

مذہب کے پروپیگنڈے کے لئے سرکاری ذرائع ابلاغ یعنی آل انڈیا ریڈیو اور دور درشن کا غلط استعمال لازماً روک دیا جانا چاہیے۔ اس عمل نے کمیونٹیوں کو مزید الگ تھلگ کر کے اور سائنسی ترقی کو تنزلی میں بدل کر بے پناہ نقصان پہنچایا ہے۔ میں ہندو بنیاد پرستی کے احیا کو بہت حد تک ذمہ دار "رامائن" اور "مہابھارت" جیسے سلسلہ وار ڈراموں کو ٹھہراتا ہوں۔ مذہب پر عمل کو صرف اور صرف عبادت گاہوں تک محدود کر دیا جانا چاہیے اور اسے سرکاری ذرائع ابلاغ، لاؤڈ سپیکروں، جلسے جلوسوں اور عوامی پارکوں میں اجتماعات کر کے دوسروں پر ٹھونسنا نہیں چاہیے۔

جب فرقہ وارانہ جنون ہمارے چاروں طرف ہلاکتیں پھیلا رہا ہو تو ہمیں کون سی حفاظتی اور تعزیری تدابیر کرنی چاہئیں؟

سب سے اہم حفاظتی تدبیر تو یہ ہے کہ ہم اپنی ذہانت کو منضبط کریں۔ یہ ایک فرسودہ

جملہ (کلیشے) بن چکا ہے تاہم یہ ہے بہت اہم بات۔ ہماری ذہانت اتنی کمزور ہو چکی ہے کہ ہم وقت سے پہلے بمشکل ہی خبردار ہوتے ہیں کہ فرقہ وارانہ جنون پیدا ہو رہا ہے۔ صرف کچھ لوگوں کو چھرے گھونپے جانے، چند گھروں کو جلائے جانے کے بعد ایسا ہوتا ہے کہ پولیس حرکت میں آتی ہے، جیسا کہ ہمارے اخبارات کہتے ہیں۔

ہمیں اپنی پولیس فورس کی بھی لازماً تنظیم نو کرنا ہوگی۔ ہمیں صرف اس سادہ سے اصول کو تسلیم کرنا ہوگا کہ اقلیتوں کو زیادہ نمائندگی دی جانی چاہیے۔ اگر کوئی علاقہ مسلمانوں کی اکثریت والا ہو تو وہاں پولیس میں ہندوؤں کی تعداد زیادہ ہونی چاہیے۔ اگر کوئی علاقہ ہندو اکثریت والا ہو تو وہاں پولیس میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہونی چاہیے۔ ایسا کیا جانا ضروری ہے کیونکہ اس سے اقلیتوں میں اعتماد دوبارہ بھرے گا کہ اقلیت کے خوف ہی تمہیں ختم کرنا ہیں۔ اسی امر کا بالخصوص باحتیاط اہتمام کرنا ہوگا کہ سب انسپکٹر لازماً اقلیتی برادریوں سے تعلق رکھتے ہوں کیونکہ وہ کسی خاص علاقے میں رونما ہونے والی صورت حال سے نمٹنے والے سب سے زیادہ اہم افسر ہوتے ہیں۔

جب کوئی فساد برپا ہو جائے تو اس وقت ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

میں اس سلسلے میں درج ذیل تجاویز پیش کرتا ہوں:

پہلی بات تو یہ ہے کہ جہاں کہیں فساد برپا ہو، اس علاقے کے پولیس آفیسر انچارج کو معطل کر دیا جانا چاہیے، کیونکہ قانون نافذ کرنے والی مشینری کی ناکامی فرائض سے غفلت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ یہ پولیس افسر کا فرض ہے کہ اسے اس امر کا علم ہوا کہ کشیدگی جنم لے رہی ہے اور اسے ختم کرنے کے لیے اس کو اقدامات کرنے چاہئیں۔ ایک نئے پولیس افسر کے تقرر کے بعد۔۔۔ جو ترجیحاً کسی بیرونی علاقے سے تعلق رکھتا ہو۔۔۔ پوری انتظامیہ کو اس کے ماتحت کر دیا جانا چاہیے۔ یہ اس افسر کا فرض ہوگا کہ وہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی معیت میں علاقے میں کرفیو نافذ کرے اور تشدد کو قابو کرنے کے لیے جو اقدامات کرنا چاہتا ہو، کرے۔

ہمیں چاہیے کہ فسادیوں کے مقدمے فوری سماعت والی عدالتوں میں چلائیں۔ فرقہ وارانہ فسادات کے مجرموں کو شاذ ونادر ہی عدالت میں لایا گیا ہے۔ فرقہ پرست قاتلوں کو شاذ ہی سزا ملی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے خلاف کوئی شخص گواہی دینے کو تیار نہیں ہوتا۔ میری رائے یہ ہے کہ جس مقام پر فساد ہو، وہیں فوری سماعت کے مقدمات چلائے جائیں اور مجسٹریٹ کو یہ اختیار لازماً دیا جانا چاہیے کہ وہ علاقے پر اجتماعی جرمانے عائد کر سکے اور جن لوگوں کو وہ قصوروار سمجھتا ہو، انہیں سرعام کوڑے لگوائے۔

بلاشبہ مذکورہ بالا تجاویز میں سے کوئی ایک بھی اس وقت تک بروئے عمل نہیں لائی جا سکتی جب تک کہ ہم اپنے ملک کے آئین میں متعین کردہ سیکولرازم کے تصور کو پوری طرح نہیں اپناتے اور ایسی حکومت کو نہیں ٹھکراتے کہ جو معمولی سی بھی فرقہ پرست ہو۔ بصورت دیگر ہمیں مودی جیسی مزید حکومتیں ملیں گی، جو پولیس افسروں کو فسادات روکنے میں ناکامی پر نہیں بلکہ فسادات بھڑکانے میں ناکامی پر دوسری جگہ ٹرانسفر کر دیں گی۔ کتنی المناک بات ہے کہ ہم نے سیکولرازم کے معنی بگاڑ دیئے ہیں اور اس کی وہ تعریف (Definition) کرتے ہیں جو ہمیں موزوں لگے۔ بعض لوگوں نے تو یہاں تک تجویز دی ہے کہ ہمیں ہندوستان سے سیکولرازم کو ہی مٹا دینا چاہیے۔ کوئی پانچ سال پہلے کی بات ہے کہ بی جے پی کی منعقد کردہ سرکاری استقبالیہ تقریب میں تقریر کرتے ہوئے دہلی میں شنکراچاریہ نے کہا کہ لفظ ''سیکولر'' کو آئین سے نکال دیا جانا چاہیے۔ اسے یہ نقطہ اٹھانے کی زحمت ہی نہیں کرنی چاہیے تھی کیونکہ کمیونسٹوں کے استثنا کے ساتھ ہمارے بیشتر سیاستدانوں نے عملاً اپنی لغت سے سیکولر ازم کا لفظ مٹا ڈالا ہے۔ سیاست اور مذہب کے مابین لکشمن ریکھا اب موجود نہیں رہی۔ مذہب سیاست کی سلطنت پر یلغار کر چکا ہے اور مکمل طور پر اس پر حاوی ہو گیا ہے۔ یوں ہم نے پنڈت نہرو کے وضع کردہ سیکولرازم کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی ہے۔

پرانی باتیں دہرانے پر معذرت کرتے ہوئے میں اپنے قارئین کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ سیکولرازم کے دو مفاہیم ہیں۔ مغربی تصور کے مطابق ریاست اور مذہب کے اعمال میں

واضح فرق ہے۔ ریاست کے اعمال میں سیاست شامل ہے جبکہ مذہب کے اعمال سرکاری یا غیر سرکاری عبادت گاہوں کے اندر محدود رہتے ہیں۔ نہرو نے اسی تصور کو قبول کیا تھا، اس کا پرچار کیا تھا اور اس پر عمل کیا تھا۔ دوسرا تصور ہے تمام مذاہب کا مساوی احترام کرنا۔ اس تصور کا پرچار اور اس پر عمل باپو گاندھی اور مولانا آزاد جیسے انسانوں نے کیا اور یہ ان کی زندگی تک برقرار رہا۔ ان کے بعد یہ تصور محض مذہبیت کی نمائش تک محدود ہو کر رہ گیا۔ اگر تم ہندو ہو تو مسلمانوں کی کسی درگاہ چلے جاتے ہو یا افطار پارٹی دیتے ہو۔ اگر تم مسلمان ہو تو اپنے ہندو دوستوں کے ساتھ دیوالی مناتے ہو۔ سیکولرازم زوال پا کر اس نوع کے دکھاوے تک محدود ہو گیا ہے۔ وقت ثابت کر چکا ہے کہ جہاں تک سیکولرازم کا تعلق ہے تو نہرو درست تھا، گاندھی اور آزاد غلط۔

ہمارے وقت کی ضرورت یہ ہے کہ ہم سیکولرازم کے نہرو والے تصور کا احیا کریں۔ جو لوگ سیاست کے میدان میں ہیں یا انتخابی عہدوں پر ہیں انہیں ضرور بالضرور مذہبی رسومات میں شریک نہیں ہونا چاہیے۔ نہرو نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ انہوں نے کبھی مذہبی لوگوں کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ انہوں نے نہ سادھوؤں کو، نہ سنتوں کو، نہ ملاؤں کو اور نہ ہی پادریوں کو ریاستی معاملات میں دخل اندازی کرنے کا موقع دیا۔ خرابی ان کی بیٹی اندرا گاندھی کے اقتدار میں آنے کے بعد پیدا ہونا شروع ہوئی۔ اس کے ساتھ دھیریندر برہما چاری جیسے لوگ اہم شخصیت بن گئے۔ نجومی اور تانترک فیصلہ ساز حلقوں میں شامل ہو گئے۔ ہمارے رہنما بوٹا سنگھ، بلرام جاکھڑ اور راجیو گاندھی جیسے لوگ تھے، جو دیورا ہا بابا کو خراج عقیدت ادا کرنے جاتے تھے۔ ہمارے ہاں چندر سوامی اور سیٹلائٹ بابا (SATELLITE BABA) جیسے لوگ تھے، جو وزیروں اور وزرائے اعلیٰ کے گھروں میں جھاڑ پھونک کرنے جاتے تھے۔ حد تو یہ ہے کہ کانگرس نے مسلمانوں کے ووٹوں کے لیے شاہی امام کو بھی اپنے حلقہ اثر میں لانے کی کوشش کی اور پھر ہم نے صاحب سنگھ ورما کی دہلی حکومت دیکھی اور بعد ازاں یہ دیکھا کہ بی جے پی کی زیر قیادت این ڈی اے حکومت نے

شنکر اچاریہ کو سرکاری مہمان کے طور پر بلایا اور اس سے قومی اہمیت کے قانونی معاملات کا فیصلہ کروایا۔

دھرم کو زندگی کے ہر شعبے میں گھسیٹا جارہا ہے۔ اسے لازماً روکنا ہوگا۔ یہ پاگل پن کی طرف جانے والا راستہ ہے۔ اپنے بھجن اور شبد گاؤ، جتنا بھی چاہے گاؤ، مگر اپنے گھروں میں یا اپنی عبادت گاہوں کے اندر۔ یہ تمہاری روح کی نجات کے لئے ہے۔ قوم کی روح کو ہمارے آئین اور قانون پر چھوڑ دو۔

ہندوستان کو ایک نئے دھرم کی ضرورت

"جب ہم بھگوان کو مہربان اور منصف کے طور پر بیان کرتے ہیں تو تضاد بیانی کر رہے ہوتے ہیں۔تم بھگوان پر وشواس کیے بغیر ایک نیک انسان ہو سکتے ہو۔۔۔ کام پوجا ہے پوجا کام نہیں۔۔۔تشدد گھٹیا پن کی گھناؤنی ترین صورت ہے اور ہمیں اس سے زبانی اور عملی طور پر دور رہنا ہوگا"۔

ہندوستان کو ایک نئے دھرم کی ضرورت

بلاشبہ ہندوستان کے مسئلے کا حل یہی ہے کہ وہ ایک نئے مذہب کو اپنا لے۔ میں جانتا ہوں کہ میں ایک غیر حقیقت پسندانہ بات کر رہا ہوں تاہم میں اپنے قارئین کو اپنے اس خیال سے آگاہ ضرور کرنا چاہوں گا۔ ہو سکتا ہے کہ آپ میں سے کچھ لوگ اچھے شعور کی طرف مائل ہو جائیں اور میں ''فنڈوز'' (FUNDOOS) کو تھوڑی بہت زک پہنچانے میں کامیاب ہو جاؤں۔

برنارڈ شا نے ایک مرتبہ لکھا تھا کہ ہر ذہن اپنا مذہب خود بناتا ہے گو کہ اس کے ایک سو روپ (VERSION) ہوتے ہیں۔ میں ساری زندگی اپنے لیے ایک مذہب تخلیق کرنے کی جدوجہد کرتا رہا ہوں۔ میں اسے علامہ اقبال کے الفاظ میں پیش کرتا ہوں:

ڈھونڈتا پھرتا ہوں اے اقبالؔ اپنے آپ کو
آپ ہی گویا مسافر آپ ہی منزل ہوں میں

کئی برس اپنے پیدائشی مذہب سکھ مت کو پڑھنے، دنیا کے دیگر بڑے مذاہب کے صحائف اور ان کے بانیوں کی زندگی کا مطالعہ کرنے اور امریکی یونیورسٹیوں میں تقابلی مذاہب (COMPARATIVE RELIGIONS) کی تدریس کے بعد میں محسوس کرتا ہوں کہ میں ان ہندوستانیوں کے لئے، کہ جو اپنی خاطر غور و فکر کرنے کی جرأت سے مالا مال ہیں، ایک نیا دھرم پیش کرنے کی اہلیت رکھتا ہوں۔ میرے اس خیال کی بنیاد یہ مفروضہ ہے کہ بیشتر لوگوں کو کسی قسم کے عقیدے کی ضرورت ہوتی ہے، کہ کسی شخص کو جذباتی تسکین و

طمانت اس عقیدے سے ملتی ہے کہ جس میں وہ پیدا ہوتا ہے، کہ جس کی رسومات نے کسی شخص کی پرورش میں جوہری کردار ادا کیا ہے۔ آج جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ پیدائشی مذہب کی بنیاد کو قبول کیا جائے اور اس جھاڑ جھنکاڑ کو صاف کر دیا جائے، جو اس کے اردگرد جمع ہو گیا ہے اور عقل اور کامن سینس (COMMON SENSE) سے محاذ آرائی کرتا ہے۔ میں نئے دھرم کے تصور کو اپنے بہت باشعور ہم وطنوں کے سامنے غور اور تبصرہ کرنے کے لیے پیش کرتا ہوں۔

سب سے پہلے میں پانچ موضوعات پر بات کروں گا جنہیں دھرم کے ستون تصور کیا جاتا ہے: پرماتما (GOD) پر ایمان، اوتاروں اور گروؤں کا احترام، دھرم پستکوں کا مقام اور استعمال، پرستش گاہوں کا تقدس اور پوجا پاٹ۔ چونکہ مجھے ان موضوعات پر جو کچھ کہنا ہے ممکن ہے وہ بظاہر منفی انداز میں تنقیدی محسوس ہو، اس لئے میں بعض تصورات کو مثبت قبولیت کے لئے مثبت انداز میں پیش کروں گا۔

ہندومت اور سکھ مت میں بھگوان کا تصور اور نام مختلف ہیں تاہم صفات مشترک ہیں۔ بھگوان پیدا کرنے والا، بچانے والا اور تباہ کرنے والا ہے۔ وہ سب کچھ جانتا ہے اور سب کچھ کر سکتا ہے۔ وہ منصف اور مہربان ہے، تاہم وہ نافرمان لوگوں کے ساتھ سختی بھی کرتا ہے۔ جب ہم بھگوان کے تصور پر غور و فکر کرتے ہیں تو ہمیں ان سوالوں کا جواب دینا پڑتا ہے جو ایک ہزار سال سے زیادہ عرصے پہلے آدی شنکر نے اپنے آپ سے دریافت کئے تھے:

> کستوم؟ کو ہم؟ کتاہ آیتاہ؟ کو میں جانی؟ کو میں تاہ؟ (میں کون ہوں؟ میں کہاں سے اور کس طرح آیا ہوں؟ میرے حقیقی ماں باپ کون ہیں؟)

بنیادی سوالات، جو کہ تقاضائے جواب کرتے ہیں، وہ یہ ہیں: ہم کہاں سے آئے ہیں؟ کیوں آئے ہیں؟ جب ہم مر جاتے ہیں تو کہاں چلے جاتے ہیں؟

مختلف مذاہب نے ان سوالات کے مختلف جواب دیئے ہیں۔ ان جوابات کو دو گروپوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے(1) ایسے جوابات جو یہودیت، عیسائیت اور اسلام نے دیئے ہیں (2) ایسے جواب جو ہندومت، جین مت، بدھ مت اور سکھ مت نے دیئے ہیں۔ یہودیت، عیسائیت اور اسلام کے مطابق خدا نے دنیا کو تخلیق کیا، نوع انسان اور زندگی کی تمام دوسری صورتوں کو بڑھانے کے لئے آدمؑ اور حواؑ کو بھیجا۔ ایک دن تمام زندگی ختم ہو جائے گی، قیامت کے دن سب انسانوں کو قبروں سے اٹھایا جائے گا اور دنیا میں ان کے اچھے برے اعمال کے حوالے سے حساب کتاب لیا جائے گا اور انہی کے مطابق انہیں جنت یا جہنم میں بھیج دیا جائے گا۔ یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کا تصور زندگی خطی ہے: یہ آغاز، وسط اور انجام رکھتی ہے۔ جبکہ ہندو دائروی (CYCLICLE) نظریئے کے مطابق نہ کوئی آغاز ہے اور نہ انجام بلکہ پیدائش موت اور دوبارہ پیدائش کا ایک لاختتم چکر (سمسار) ہے۔ انسان کو اس کے اعمال کی سزا یا جزا دوبارہ پیدائش کے وقت حاصل ہونے والے روپ سے ملتی ہے۔ ایک مرحلے پر انسان سمسار سے آزاد ہو کر بھگوان میں مل جاتا ہے۔ (یوگ) اسے موکش یعنی نجات کہا جاتا ہے۔

یہودیت، عیسائیت اور اسلام کے سادہ تصور کے مقابلے میں سمسار کا تصور پیچیدہ ہے۔ اپنی گزشتہ زندگیوں کی باتوں کو یاد رکھنے والے بچوں کی کہانیاں طفلانہ تصورات ہیں اور زیادہ تر ہندومت، سکھ مت اور جین مت وغیرہ کو ماننے والے گھرانوں تک محدود ہیں۔ سائنسدانوں نے مابعد النفسیات (پیرا سائیکالوجی) کے جتنے بھی معاملات کی چھان پھٹک کی سب فراڈ نکلے۔ سادہ سی صداقت یہ ہے کہ ہم نہیں جانتے ہم کہاں سے آئے ہیں، اور ہماری ہستی کا کوئی مقصد ہے بھی یا نہیں، ہم نہیں جانتے مرنے کے بعد ہم کہاں چلے جاتے ہیں۔ شاد عظیم آبادی نے اس بات کو بڑے خوبصورت انداز میں ایک شعر میں بیان کیا ہے:

سنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سُنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

والٹیئر کا کہنا ہے کہ وہ مشکل سے ہی یہ یقین کرے گا کہ ایک گھڑی ہو اور اس کو بنانے والا گھڑی ساز نہیں ہو۔ پھر وہ کہتا ہے: ''اگر کوئی خدا نہیں ہے تو اسے ایجاد کرنا ضروری ہے۔'' خدا کی تلاش لا حاصل کی جستجو ہے۔ جوبرٹ نے پوچھا تھا: ''کیا میں یہ کہہ سکتا ہوں؟ خدا کو بآسانی جانا جا سکتا ہو بشرطیکہ اس کی تعریف متعین کرنا ضروری نہ ہو۔'' میں ایک مرتبہ پھر ایک اردو نظم سے اقتباس دیتا ہوں:

کوئی ملنے کو تیرا نشاں بھی ہے؟
کوئی رہنے کو تیرا مکاں بھی ہے؟
تیرا چرچا جہاں کی زبانوں پہ ہے
تیرا شہرہ زمانے کے کانوں میں ہے
مگر آنکھوں سے دیکھا تو پردہ نشیں
کہیں تو نہ ملا، تیرا گھر نہ ملا

ایک اردو شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

تو دل میں تو آتا ہے، سمجھ میں نہیں آتا
بس جان گیا کہ تیری پہچان یہی ہے

جب ہم بھگوان کو سب کچھ جاننے والا، ہر جگہ موجود، مہربان اور منصف کے طور پر بیان کرتے ہیں تو تضاد بیانی کر رہے ہوتے ہیں۔ دنیا میں بے انتہا ناانصافی ہے، معصوم اور بھگوان سے ڈرنے والے لوگ اتنی مصیبتوں کا شکار ہیں کہ بمشکل ہی یہ دلیل دی جا سکتی ہے کہ اس دنیا کے پیچھے کوئی الوہی مقصد بھی ہے۔ جب سات سکول جانے والے بچوں کے باپ کو شرابی ڈرائیور ٹرک تلے کچل کر فرار ہو جائے تو کوئی انسان اسے ایک مہربان اور منصف بھگوان سے کیسے منسوب کر سکتا ہے؟ یا تو وہ حادثے کو روکنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا یا اتنا شقی تھا کہ بچوں والے خاندان پر مصیبت نازل کر دی۔ اس وقت بھگوان کہاں تھا جب شر پسند لوگوں نے کنشکا میں بم نصب کیا اور سینکڑوں معصوم مردوں، عورتوں اور بچوں کو قبر

میں پہنچا دیا؟ یا تب وہ کہاں ہوتا ہے جب کوئی زلزلہ پوری کی پوری بستی کو غارت کر دیتا ہے؟ جب تک تم ہم ان سوالوں کے جواب منطقی طور پر نہیں دے سکتے اور ''سابقہ جنموں کے گناہوں کا کفارہ'' جیسی وضاحتوں میں پناہ لینا نہیں چھوڑتے۔ اس وقت تک خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔

زمین پر زندگی کے آغاز کے حوالے سے ڈارون کے نظریئے کو مان لینا بہتر ہے۔ کم از کم یہ ہمیں امیبا تک تو لے جاتا ہے۔ نہ تو سائنسدان یہ جاننے کے اہل ہیں کہ امیبا کو کس نے تخلیق کیا تھا، کون سورج، چاند اور ستاروں کو وجود میں لایا تھا۔ نہ ہی سائنس دان اور ماہرین روحانیات اب تک اس قابل ہو سکے ہیں کہ موت کے اسرار سے پردہ اٹھا سکیں۔ ان حالات میں کوئی ذہن انسانی اس سوال کا کہ ''کیا بھگوان ہے؟'' یہی دیانتدارانہ جواب دے سکتا ہے کہ ''میں نہیں جانتا''۔

یاد رکھنے والی اہم بات یہ ہے کہ بھگوان پر وشواس کا اچھے یا برے ہونے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تم بھگوان پر وشواس کئے بغیر ایک نیک انسان ہو سکتے ہو اور اس پر وشواس رکھتے ہوئے بھی ایک لائق نفرت ولن ہو سکتے ہو۔

☆☆☆
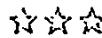
ہر مذہب میں خدا سے زیادہ اس مذہب کے بانی کا احترام کیا جاتا ہے، اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ لوگ اپنے اوتاروں اور گروؤں کے بارے میں بھگوان کی نسبت قدرے زیادہ جانتے ہیں۔ وہ ماورائے انسانی (SUPERHUMAN) قوتوں کے حامل انسان ہوتے ہیں، جن کے ذریعے وہ ان گنت لوگوں کو متاثر کرتے ہیں۔ فطری سی بات ہے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے پیروکاران کے بارے میں بہت سی ایسی کہانیاں بنا لیتے ہیں کہ وہ انسان سے کچھ سوا دکھائی دینے لگتے ہیں۔

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے تو ہم نے اپنے اوتاروں کو بھگوان کی تجسیم، اس کے منتخب شدہ انسان اور اس تک براہِ راست رسائی رکھنے والے قرار دے دیا ہے۔ حقیقت

معاملہ تو یہ ہے کہ ہمیں ان کے بارے میں کوئی ٹھوس اور مصدقہ معلومات مشکل ہی سے حاصل ہوں گی کہ وہ کس طرح کے انسان تھے۔ انہیں لا انسانی بناتے ہوئے (DEHUMANIZING) ہم نے انہیں سراسر نیک اور انسانی خطاء سے ماورا قرار دے کر ان کے ساتھ ناانصافی کی ہے۔ ہم اس عمل کی ایک مثال مہاتما گاندھی کے اس تصور میں ملاحظہ کر سکتے ہیں جو ہندوستانیوں نے ان کے بارے میں وضع کر رکھا ہے۔ بلاشبہ وہ دنیا کے ایک عظیم ترین انسان تھے، تاہم وہ انسان کمزوریوں کے بھی حامل تھے۔ ان کے چار بیٹوں میں سے کوئی بھی ان پر نہیں گیا بلکہ ایک نے تو ان پر تھوکتے ہوئے اسلام قبول کر لیا۔ وہ خود پسند تھے اور اپنے خلاف ہلکا سا تبصرہ سن کر طیش میں آ جاتے تھے اور وہ ایسے خبطی تھے کہ نوجوان لڑکیوں کو ننگا اپنے قریب بٹھا کر اس امر کو یقینی بناتے تھے کہ وہ اپنی شہوانی خواہشات پر غالب آ چکے ہیں۔ ان تمام خامیوں نے انہیں ایک عام سا انسان بنا دیا۔ نیز وہ اتنے بلند بھی ہو گئے کہ انسانیت کے لیے ایک مثال بن گئے، لیکن ہم نے انہیں پوجا استھان میں اونچائی پر رکھ کر انہیں ان کی انسانی حیثیت اور رتبے سے محروم کر دیا۔ یہی وقت ہے کہ ہم اپنے اوتاروں کو ایسی تاریخی شخصیات کی حیثیت سے ان کا موزوں مقام دیں جنہوں نے انسانیت کی بھلائی کے لیے کام کیا تھا۔ اس سے سوا کچھ نہیں۔

☆☆☆
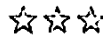
میں نے تمام دھرم پستکوں کا مطالعہ کیا ہے اور ایک سے زیادہ مرتبہ کیا ہے۔ ہماری دھرم پستکیں غیر سائنسی ہیں (انسان ان کے مصنفوں کو الزام نہیں دے سکتا کیونکہ ان کے زمانے میں سائنس نے بہت کم ترقی کی تھی) ہماری دھرم پستکوں میں باتوں کو دہرایا گیا ہے اور وہ انتہائی اکتا دینے والی ہیں۔ جن لوگوں نے یہ اخلاقی ضابطے وضع کئے تھے بلاشبہ انہوں نے ایک مفید کام کیا تھا اور دھرم پستکوں کے بعض حصے ادبی محاسن کے حامل بھی ہیں۔ میں اپنی تحریروں میں اکثر و بیشتر بائبل، اپنشد اور گرنتھ صاحب سے اقتباسات دیا کرتا ہوں۔ یہ کتابیں ادب کا ایسا اعلیٰ شاہکار ہیں کہ کالی داس، شیکسپیئر، گوئٹے، ٹالسٹائی، غالب، ٹیگور اور

اقبال کی تخلیقات ان کے پاسنگ بھی نہیں ہیں۔

تاہم پوتر پستکوں کے حوالے سے یہ میرا ذاتی خیال ہے اور میں جن جن سے ملا ہوں کوئی اس سے اتفاق نہیں کرتا۔ بیشتر لوگ روحانی انکشافات سے گہرا اثر قبول کیے ہوئے ہیں۔ لہٰذا میں انہیں یہ بتانے والا کون ہوں کہ ان کا ردعمل مسلسل تلقین کا پیدا کردہ ہے؟ تاہم وہ اس وقت مجھے غلط قرار نہیں دے سکتے جب میں یہ کہتا ہوں کہ ان پستکوں کی قدر و قیمت خواہ کچھ ہی ہو مگر ان کا مطالعہ کیا جانا چاہیے اور انہیں سمجھنا چاہیے۔ تاہم ان کی پوجا نہیں کرنی چاہیے۔ اس تناظر میں سب سے زیادہ مشکل امر یہ ہے کہ بتوں کی پوجا نہ کرنے والے سکھوں کے اپنی دھرم پستک کے ساتھ برتاؤ کی توضیح کی جائے۔ وہ اپنی دھرم پستک کو سوتے میں بستر پر ساتھ رکھتے ہیں، صبح جاگتے ہیں تو اسے پڑھتے ہیں، اس کے اوپر عالیشان چھتر تانتے ہیں، اس کے مطالعے کے دوران مورچھل جھلتے ہیں۔ اس کے لئے بڑے بڑے جلوس نکالتے ہیں۔ وہ اس کے مسلسل (NONSTOP) پڑھے جانے (اکھنڈ پاٹھ) کا اہتمام کرتے ہیں، جس میں بہت سے لوگ دو دن اور رات اسے پڑھتے چلے جاتے ہیں (انہیں اکثر مختلف مقاصد کے لیے مختلف شرح معاوضہ پر لایا جاتا ہے) اور انہیں یقین ہوتا ہے کہ ان کے دوسرے کمرے میں مزے سے سوئے ہونے کے باوجود اس کے پڑھے جانے سے انہیں فائدہ ہوگا۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ جن گروؤں کی تحریریں گرنتھ صاحب کے روپ میں اکٹھی کی گئی ہیں اپنے پیروکاروں کے بارے میں کیا کہتے۔ وہ لوگ، جن میں سے بہت کم ان کے پیغام کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

☆☆☆
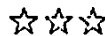
میرا ایمان ہے کہ پوجا کا سب سے جائز استھان گھر ہے۔ تاہم ایسے مذاہب ہیں جو مخصوص عبادت گاہوں میں عبادت کرنے کی تاکید کرتے ہیں۔ سکھوں نے ٹمپل اور گوردوارے ہیں جن کے بغیر کیرتن اور کتھا اپنا اثر کھو دیں گے۔ ایک ایسے ملک میں کہ جہاں کلبوں، شراب خانوں اور پکچر ہاؤسز جیسی جگہیں کم ہیں، پوجا استھان آزادانہ دستیاب ضرر

تفریح اور ایک سی سوچ رکھنے والے افراد کی رفاقت مہیا کرتے ہیں۔ تاہم حالیہ برسوں میں پوجا استھان لڑائی کے میدان بن گئے ہیں اور انہیں دوسرے مذاہب کے خلاف پروپیگنڈے کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ گولڈن ٹیمپل، بالخصوص اکال تخت، بندوق برداروں کے کنٹرول میں رہا۔ جو اپنے گروؤں کی طرح محبت کا پیغام پھیلانے کی بجائے نفرت کا پرچار کرتے تھے اور رام جنم بھومی، بابری مسجد تنازعے میں بے شمار جانیں ضائع ہو چکی ہیں۔ حکومت کو ایسی پالیسی بنانی چاہیے جس کے تحت مزید پوجا استھانوں کا تعمیر کیا جانا ممنوع قرار دے دیا جائے۔ ہمارے پاس پہلے ہی بہت زیادہ پوجا استھان موجود ہیں۔ حکومت کو عوامی پارکوں یا کھلی جگہوں میں مذہبی اجتماعات کی اجازت بالکل نہیں دینی چاہیے اور اگر کوئی پوجا استھان جھگڑے فساد کا باعث بن رہا ہو یا اُسے ناپسندیدہ عناصر غلط استعمال کر رہے ہوں تو اُس کو حکومت فوراً اپنے قبضے میں لے لے۔

ایک پنجابی صوفی شاعر نے اس موضوع پر میرے احساسات کی ترجمانی کرتے ہوئے کیا خوب کہا تھا:

مسجد ڈھا دے، مندر ڈھا دے، ڈھا دے جو کچھ ڈھیندا
اک کسے دا دل نہ ڈھاویں، رب دلاں وچ رہندا

اس بات سے کسی کو اختلاف نہیں ہوسکتا کہ ہم ہندوستانی دنیا کے تمام دوسرے لوگوں کی نسبت مذہبی رسومات میں زیادہ وقت صرف کرتے ہیں۔ ہندی ضرب المثل ''سات وار آٹھ تہوار'' مبالغہ آرائی نہیں ہے۔ ہم ایک سال میں جتنی مذہبی چھٹیاں کرتے ہیں ذرا انہیں شمار تو کیجئے۔ پھر ان میں ان گھنٹوں کو جمع کیجئے جو لوگ پوجا استھانوں میں، یاتراؤں پر، ست سنگوں میں شریک ہوکر، پروچنوں، کیرتنوں، بھجنوں وغیرہ کو سننے میں ضائع کرتے ہیں۔ حاصل جمع ہوشربا نکلے گا۔ خود سے پوچھئے کہ کیا ہندوستان جیسا کوئی ترقی پذیر ملک مادی فائدے نہ پہنچانے والے کاموں میں اتنا زیادہ وقت ضائع کرنے کا متحمل ہوسکتا ہے۔ خود سے یہ بھی پوچھئے کہ کیا کوئی شخص مالا پھیر کر بہتر انسان بن سکتا ہے؟ کیا یہ سچ نہیں

ہے کہ ڈاکو بھی لوٹ مار پر نکلنے سے پہلے اپنی کامیابی کے لئے پرارتھنا کرتے ہیں؟ اور یہ کہ بدترین چور بازاری کرنے والے اور ٹیکس چرانے والے اکثر و بیشتر پوجا پاٹھ میں سرگرمی سے حصہ لیتے ہیں؟

میں اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ ہر عورت اور مرد اپنے وقت کو اپنی مرضی سے استعمال کرنے کا پورا پورا حق رکھتا ہے۔ اگر انہیں پوجا پاٹھ سے تسکین و طمانیت ملتی ہے تو انہیں ایسا کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔ تاہم مذہبی لوگوں کو اس بات کا کوئی حق نہیں ہے کہ دوسرے لوگوں پر اپنے مذہب کو تھوپیں۔ کیرتن اور بھجن منڈلیوں کے لئے لاؤڈ سپیکر کا استعمال دوسروں پر اپنے مذہب کو تھوپنے کے مترادف ہے۔ سب سے زیادہ غیر ہوش مندانہ مثال شب بھر کا جاگرن ہے، جو پورے علاقے کے خوابیدہ لوگوں کو بے آرام رکھتا ہے۔ ریڈیو اور ٹی وی جیسے سرکاری ذرائع ابلاغ سے مذہبی تہواروں اور مذہبی گیتوں کو نشر کرنے سے مذہب کی ترویج ہوتی ہے لہٰذا اس سلسلے کو ختم کر دینا چاہیے۔ بارونق بازاروں میں جلوس لے کر گزرنا اور شہری زندگی کو درہم برہم کر دینا بھی دوسروں پر اپنے مذہب کو تھوپنے کے برابر ہے لہٰذا اس کی بھی حوصلہ شکنی کی جانی چاہیے۔

نیم خواندہ لوگ جو سیکولر دکھائی دینے کے خواہاں ہوتے ہیں، آج کل ایک جدید خبط کا شکار ہو رہے ہیں۔۔۔ اور وہ ہے مراقبہ۔ وہ ایک جھوٹے احساس برتری کے ساتھ کہتے ہیں: ''میں مندر وندر نہیں جاتا، میں تو مراقبہ کرتا ہوں۔'' یہ مراقبہ کیا ہے: پدم آسن (کنول کے آسن) میں بیٹھنا، سانسوں کو قابو میں لانا اور ذہن کو ''بندروں کی طرح ایک خیال سے دوسرے کی طرف چھلانگ لگانے'' سے روکنے کے لیے خالی کرنا۔ اس زبردست ارتکاز سے ریڑھ کی ہڈی میں کنڈلی مارے بیٹھی کنڈالنی ناگن پھن اٹھاتی ہے۔ یہ بل کھاتی ہوئی اوپر سفر کرتی جاتی ہے یہاں تک کہ کھوپڑی میں اپنی منزل تک پہنچ جاتی ہے۔ تب کنڈالنی پوری طرح جاگرت (بیدار) ہو جاتی ہے اور وہ انسان مطمئن ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی منزل کو پہنچ چکا ہے۔ مراقبے سے کیا حاصل ہوتا ہے؟ عمومی جواب ہے کہ ''ذہنی سکون'' حاصل ہوتا ہے۔

اگر آپ مزید دریافت کریں کہ ذہنی سکون سے کیا حاصل ہوتا ہے؟ تو آپ کو کوئی جواب نہیں ملتا کیونکہ کوئی جواب ہے ہی نہیں۔ ''ذہنی سکون'' ایک بانجھ تصور ہے جس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ مراقبہ ہوسکتا ہے کہ منتشر ذہن والے لوگوں یا ہائپر ٹینشن (HYPERTENSION) میں مبتلا لوگوں کے لئے تو مفید ہو، تاہم اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اس سے تخلیقیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اعداد و شمار سے ثابت کیا جا سکتا ہے کہ فن، ادب، سائنس اور موسیقی کے تمام عظیم شاہکار انتہائی مضطرب اذہان کی پیداوار تھے، وہ اس وقت وجود میں آئے جب ذہن ٹوٹ بکھرنے کو تھے۔ علامہ اقبال کی چھوٹی سی دعا بڑی برمحل ہے:

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

علامہ اقبال کی شاعری میں ایک لفظ جو مستقل طور پر ظاہر ہوتا ہے، وہ ہے ''تلاطم''۔۔۔ ذہن کی بے قراری، تخلیقیت کی شرطِ اولیں۔

ہندوستان کے نئے دھرم کی بنیاد عمل کی اخلاقیات (WORK ETHIC) ہوگی۔ نئے دھرم کو لوگوں کو دوبارہ محنت کرنے کے لئے توانائی کی بحالی کی خاطر تفریح کا وقت مہیا کرنا ہوگا۔ مگر غیر تخلیقی مشاغل کی حوصلہ شکنی کرنی ہوگی۔ ہمیں وقت بالکل ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ حضرت محمدؐ کی ایک حدیث ہے:

وقت ضائع مت کرو، وقت خدا ہے۔

☆☆☆

میں نے پوجا پاٹھ، رسوم اور مراقبے کے حوالے سے جن خیالات کا اظہار کیا انہیں ایک نعرے میں سمونا چاہتا ہوں، جسے میں نے جدید ہندوستان کے ماٹو (MOTTO) کے طور پر وضع کیا ہے:

''کام پوجا ہے، پوجا کام نہیں''

میرا اعتقاد ہے کہ ہر شخص کے مذہب کی اساس یہ ہونی چاہیے کہ وہ دوسرے اشخاص کو

دُکھ نہ دے، زندہ اشیاء کو نقصان نہ پہنچائے اور اپنے ماحول کا تحفظ کرے۔

اہمسا پرمو دھرما

(عدم تشدد اعلیٰ ترین دھرم ہے)

اس تناظر میں عدم تشدد منفی نہیں بلکہ ایک مثبت تصور ہے، جو نیک اندیشی کے فروغ اور تحفظ حیات کے لئے ضروری ہے۔ تشدد گھٹیا پن کی گھناؤنی ترین صورت ہے اور ہمیں اس سے زبانی اور عملی طور پر دور رہنا ہوگا۔

ہمارے دھرم کو مستقبل کے لئے بہتر عمل کرنا چاہیے۔ اسے بڑھتی آبادی کرنی چاہیے۔ دو بچوں کی پیدائش کے بعد والدین کو نس بندی کروا دینی چاہیے۔ انہیں کوئی حق نہیں ہے کہ ایک ایسے ملک پر آبادی کا بوجھ بڑھائیں جو پہلے ہی انتہائی گنجان آباد ملک ہے۔ اسی طرح درختوں کی کٹائی، جھیلوں، دریاؤں اور سمندروں کو آلودہ کرنے کو غیر مذہبی اعمال تصور کیا جانا چاہیے۔ زمین کو تو ویسے بھی اعادۂ شباب کی انتہائی ضرورت ہے۔ ہم جنگلوں کو کاٹ کر زمین کو برہنہ اور شکستہ کر رہے ہیں اور کیمیائی کھادیں استعمال کر کر کے اس کی زرخیزی کو برباد کر رہے ہیں اور کیڑے مار ادویات استعمال کر رہے ہیں۔ جب انسان مر جائیں تو انہیں زمین کو ہی لوٹا دیا جانا چاہیے کہ بیشتر مذاہب کے مطابق وہ زمین ہی سے تخلیق کئے گئے تھے۔ تعمیراتی استعمال کے لئے لکڑی کے حصول کی خاطر جنگلوں کی کٹائی کو فی الفور روک دیا جانا چاہیے۔ جہاں گیس اور الیکٹرک چتا سوز نہیں ہیں وہاں لاشوں کی تدفین کی جانی چاہیے۔۔۔ زمین کو غیر پیداواری بنا دینے والی مستقل قبروں میں نہیں بلکہ اس مقصد کے مخصوص کھلی جگہوں میں۔ اور ہر تیسرے سال اس زمین پر ہل چلا دیئے جانے چاہئیں اور اسے دوبارہ زراعت کے لیے استعمال کیا جانا چاہیے۔

میں اپنے عقیدے کو اس پیش پا افتادہ جملے میں سمونا چاہوں گا: اچھی زندگی واحد دھرم ہے۔ انگرسول نے اس بات کو زیادہ موزوں الفاظ میں کہا ہے: ''خوشی واحد نیکی ہے، خوش ہونے کی جگہ یہی ہے، خوش ہونے کا وقت یہی ہے، خوش ہونے کا طریقہ دوسروں کی مدد کرنا

ہے۔" ایلا ویلر ولکاکس نے اسی خیال کو سادہ لفظوں میں یوں بیان کیا ہے:

"اتنے بہت سے دیوتا، اتنے بہت سے عقیدے، اتنے بہت سے
راستے کہ سر گھوم کر رہ جاتا ہے۔ جبکہ صرف مہربانی برتنے کا فن ہی وہ
سب ہے کہ جس کی اس دنیا کو ضرورت ہے۔"

☆☆☆